جلد ۱۴۶ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات

آزادی کے بعد مسلمان جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں، انھوں نے ملک کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق انھیں اپنی اصلاح و ترقی اور دوسروں کے ساتھ مل کر ملک کے فلاحی و تعمیری کاموں میں حصہ لینے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا، اس لیے وہ علمی، تعلیمی، معاشرتی اور معاشی حیثیت سے نہایت پسماندہ ہو گئے ہیں اور ان کی سیاسی بصیرت و شعور میں بڑی کمی آگئی ہے، آئے دن کے فسادات میں ان کی جان و مال اور عزت و آبرو لٹتی رہی ہے اور ایک منظم سازش کے ساتھ ان کے مذہب، ان کی تہذیب، ان کے کلچر اور ان کی زبان کو ختم کیا جاتا رہا ہے ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں ؛ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یہ طویل عرصہ انھوں نے یا تو رو دھو کر یا فریاد و احتجاج اور ان اعتراضات کے جواب میں گذارا ہے جو ان پر اور ان کی تہذیب و روایات پر فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے مسلسل کیے جاتے رہے ہیں، سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ حکمراں جماعت جو اپنے کو اقلیت نواز، مسلم دوست اور سیکولرزم کا علمبردار کہتی ہے اس نے مسلمانوں کے درد و غم کو کبھی سمجھنے اور ان کے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش نہیں کی، اس نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ مسلمان انھی حالات میں برابر گرفتار رہیں تاکہ انتخابات کے موقع پر کبھی نہ وفا ہونے والے وعدے کر کے ان کے ووٹوں سے اپنی جھولی بھر لی جائے۔

گذشتہ انتخابات کے بعد ملک میں جو سیاسی تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ بعض حلقوں کو بڑی ناگوار گذری ہے جن میں مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی شامل ہے جس کے ذاتی مفاد کو اس الٹ پھیر کے نتیجہ میں دھکا لگا ہے، چنانچہ اس کو بعض خوشگوار تبدیلیوں میں بھی تاریک پہلو دکھائی دیتا ہے اور وہ خوبیوں پر پانی پھیر کر مسلمانوں کو ان سے متنفر کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف کچھ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس تبدیلی سے مسلمانوں کے دن پھر آئے ہیں اور وہ اپنی سادہ لوحی میں تاریک پہلو کو بھی روشن سمجھنے لگے ہیں، مسلمانوں میں یوں ہی کیا کم اختلافات تھے، اس نئی صورت حال نے ان دونوں

طبقوں کو باہم متصادم بنا دیا ہے اور بعض اخباروں کے کالم مسلمان دانشوروں اور اہل قلم کے اسی فضول مناقشہ کے لیے وقف ہو گئے ہیں، دنیا میں زوال پذیر قوموں کا یہی شیوہ ہے کہ ان کی ساری قوت و صلاحیت بے کار و بے سود بحثوں میں ضائع ہوتی ہے، اور وہ مثبت اور تعمیری کاموں کے بجائے منفی اور غیر تعمیری کام کرنے ہی کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

گذشتہ برسوں کے حالات و واقعات نے مسلمانوں کے اندر غصہ، جھنجھلاہٹ، جذباتیت، اشتعال اور ایسا اختلال و انتشار پیدا کر دیا ہے کہ وہ اپنے اہم مسائل کے بارے میں بھی غور و فکر اور ہوشمندی پر مبنی کوئی موقف اختیار نہیں کر سکے ہیں اور بعض غیر اہم اور معمولی باتوں پر وہ اپنے کو ہلاک و برباد کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ چونکہ کسی منصوبہ اور اسکیم کے بغیر ہی ہوتا ہے اس لیے ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہونا تو درکنار الٹے مزید تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک مسلمان ان فضول مناقشوں اور باہمی اختلافات میں پڑ کر ایک دوسرے کو زیر کرنے اور منفی اور بے سود کاموں میں اپنا قیمتی وقت اور صلاحیت ضائع کرتے رہیں گے انھیں شام غم کی تیرگی ختم کرنے کے لیے نئے عہد کے مطابق اپنی زندگی کا ایک واضح لائحہ عمل بنانا ہوگا اور دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے دست و بازو میں قوت پیدا کر کے خدا سے نصرت کا طالب بننا ہوگا، پیچیدگیوں اور دشواریوں کو حل کرنے کیلئے ضبط و تحمل سے کام لینا ہوگا ع مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

پروفیسر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارے ملک کے مایۂ ناز دانشور اور فارسی زبان و ادب کے ممتاز عالم اور مستند محقق ہیں، کبرسنی کے باوجود ان کا قلم رواں دواں اور مضامین نو کے انبار لگاتا رہتا ہے، معارف میں تقریباً نصف صدی سے ان کی نگارشات شائع ہو رہی ہیں اور وہ عرصہ سے اس کی مجلس ادارت کے رکن ہیں، اب دارالمصنفین کی مجلس عاملہ نے انھیں اپنی علمی مجلس کا رکن مقرر کیا ہے، ان کے ایک مکتوب گرامی

یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ماہ دسمبر میں تہران یونیورسٹی نے ان کو اعزازی پروفیسری کی ڈگری یونیورسٹی کے ایک مخصوص جلسے میں عنایت کی ہے، یہ ڈگری کم غیر ملکیوں کو دی گئی ہے اور انقلاب ایران کے بعد کا یہ پہلا اعزاز ہے جو ان کو دیا گیا، تہران ہی کے ایک اور بڑے ادارے ڈاکٹر محمود افشار کی طرف سے پہلے ادبی و تاریخی جائزے سے بھی ان کو نوازا گیا ہے، جائزے کے جلسے میں تہران کے تقریباً سارے دانشور شریک تھے، ہم پروفیسر نذیر احمد کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان اداروں کی جوہر شناسی کی داد دیتے ہیں وہ اس سے بڑے اعزاز اور اس سے بڑھ کر قدر دانی کے مستحق ہیں۔

ادھر کسی سال ناغہ نہیں جاتا کہ دارالمصنفین کو اپنے ارکان و مخلصین کی جدائی کا صدمہ نہ اٹھانا پڑے ۲ اگست کو اس کی مجلس انتظامیہ کے ایک پرجوش، سرگرم، فعال اور مخلص رکن جناب شاہ غلام خالد صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ اعظم گڈھ کے ممتاز اور کامیاب وکیل تھے، ان کی نانہال مولانا شبلی مرحوم کے خاندان میں تھی، ان سے اور ان سے نسبت رکھنے والے تمام اداروں سے مرحوم کو قلبی لگاؤ تھا مدت دراز تک شبلی نیشنل کالج کے سرگرم ممبر اور اسسٹنٹ بلکہ عملاً سکریٹری رہے، انھوں نے بڑی جانفشانی سے اسکول اور کالج کو ترقی دی اور ان کے علمی و تعلیمی معیار اور ڈسپلن کو قائم رکھا، وہ بڑے دلیر اور دبنگ تھے، کوئی بڑے سے بڑا اقدام کرنے میں ان کو ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی، اب ان کی سرگرمی اور دلچسپی کا خاص مرکز دارالمصنفین ہوگیا تھا جس کے لیے مرتے دم تک سینہ سپر رہے، اور بڑے نازک اور بحرانی دور میں انھوں نے اس کی پوری مدد کی، اس موقع پر ان کا رعب و دبدبہ، جرأت و ہمت اور مقامی اثر و رسوخ بہت کام آیا، ان میں بڑی قوت عمل اور غیر معمولی صلاحیتیں تھیں جن سے دارالمصنفین اور اس کے کارکنوں کو بڑا فائدہ پہونچا، وہ گذشتہ کئی برس سے پیہم آفات و حوادث کا نشانہ بنے ہوئے تھے جس کا اثر ان کی صحت پر بھی پڑا، گذشتہ سال قلبی دورہ پڑا، بالآخر اسی بیماری دل نے کام تمام کر دیا، اللہ تعالیٰ انھیں جنت نعیم عطا کرے اور متعلقین کو صبر جمیل دے۔ آمین!!

مقالات

شیخ نور الحق دہلوی کی شرح فارسی صحیح بخاری "تیسیر القاری"

از
ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

بعض اہم بحثیں | امامت و خلافت کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس کی وجہ سے مسلمان دو فرقوں میں بٹ گئے، اور اس سے ان کو شدید نقصانات پہونچے، اس نزاع کا ایک اہم باعث واقعۂ قرطاس بھی ہے، اس کو بعض لوگوں نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت مجروح ہوتی ہے، اور نعوذ باللہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی دعوت و تبلیغ پر مامور فرمایا تھا ان کو بیان کرنے میں آپ نے کوتاہی سے کام لیا، اگر آپ کے لیے مسئلۂ خلافت میں نامزدگی اور صراحت کرنا ضروری ہوتا تو آپ اس میں اخفا سے کیوں کام لیتے، صوفیہ باطنیہ بھی اسی قسم کی گمراہی میں جا پھنسے ہیں، جنھوں نے ظاہر و باطن کی تقسیم کرکے یہ کہا ہے کہ علم باطن صرف حضرت علیؓ کو عطا ہوا تھا، اس لیے علم باطن کا منبع انھی کو قرار دیا جاتا ہے، یہاں موقع نہیں ورنہ ہم دکھاتے کہ یہ کیسی شدید گمراہیاں ہیں جن کیلئے حضرت علیؓ کی ذات کو استعمال کیا جارہا ہے۔

واقعۂ قرطاس کے بارے میں شیخ نور الحق نے جو کچھ لکھا ہے وہ اعتدال و توازن کا نمونہ اور بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے، ملاحظہ ہو:

امام بخاریؒ نے کتاب العلم کے باب کتابۃ العلم میں واقعۂ قرطاس کے متعلق جو حدیث نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدید ہوگئی تو آپ نے فرمایا کہ کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں ایسا نوشتہ لکھ دوں جس کے بعد تم لوگ گمراہ نہ ہوگے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپ پر درد و الم غالب ہے، اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جو ہمارے لیے کافی ہے، پھر حاضرین جھگڑ پڑے اور شور و ہنگامہ برپا ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس سے تم لوگ چلے جاؤ، میرے پاس اختلاف و نزاع مناسب نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکل پڑے کہ آپؐ کے اور آپؐ کی تحریر کے درمیان حائل ہونا ہی ساری مصیبت تھی۔" (تیسیر القاری ج ۱ ص ۶۱)

شیخ نور الحق فرماتے ہیں کہ یہ حدیث خطرناک ہے جو لوگوں کی گمراہی و کجی کا باعث بن گئی ہے، بعض لوگ نہایت وثوق اور پوری قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ آپؐ کا مقصود حضرت علیؓ کیلئے خلافت نامہ تحریر کرنا تھا، مگر چونکہ حضرت عمرؓ کو ان سے عداوت اور کد تھی اور وہ آپؐ کی منشا و مراد کو سمجھ گئے تھے اس لیے انھوں نے آپؐ کو خلافت نامہ تحریر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی چاہتے تھے کہ آپؐ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں تو آپؐ نے انھیں نماز پڑھانے کا حکم کیوں نہیں دیا جبکہ وہ آپؐ کی خدمت میں موجود تھے، اور حضرت ابو بکرؓ اپنے گھر میں فروکش تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اصرار کر کے ان کے گھر سے بلوایا اور نماز پڑھانے کا حکم دیا، درحقیقت یہ ایک باطل وہم ہے جس کا سرچشمہ وہ تعصب اور بدگمانی ہے جو اساطین دین وملت کی جانب سے ان لوگوں کے دلوں میں متمکن ہے، بلکہ یہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی سوئے عقیدت کا

نتیجہ ہے، اگر آپؐ کا مقصود وہی ہوتا تو جب آپؐ نے دیکھا کہ لوگ کتابت کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں تو آپؐ نے حق کو پوشیدہ رکھنا کیسے پسند کیا، اور کیوں نہیں اپنی زبان مبارک سے یہ فرمادیا کہ میرے بعد حضرت علیؓ خلیفہ ہوں گے۔ یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کافرین کی اصلاح و ہدایت کی جانب سے بھی کبھی بے توجہی نہیں کی، جو برسہا برس تک آپؐ سے بحث و مجادلہ کرتے رہے، بلکہ آپؐ ان میں سے ایک ایک کی رہنمائی کے لیے برابر فکرمند اور سرگرداں رہے تو اپنے ان ساتھیوں کے معاملہ میں کیسے تساہل سے کام لیتے جو ہمیشہ آپؐ کے حکم کی تعمیل کے لیے بے چین رہتے، اور اپنا جان و مال سب کچھ آپؐ کے لیے نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے، اور آپؐ زندگی بھر ان سے خوش رہے تو زندگی کے آخری لمحہ میں ان کے اختلاف سے کیسے اس قدر دل برداشتہ ہو سکتے تھے کہ محض ایک لفظ نہ کہنے کی بنا پر سب کو گمراہ چھوڑ جاتے، اس سے بڑھ کر کون سی بداعتقادی آپؐ کی شان میں ہو سکتی ہے؟ اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

دراصل یہ معاملہ مبہم ہے اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ آپ کیا لکھنا چاہتے تھے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قطعی طور سے ضروریات دین، اوامر و نواہی پر استقامت، اولوالامر کی اطاعت اور اہل بیت کی عزت و حرمت کی حفاظت کی تجدید فرمانا چاہتے تھے، کیونکہ ایک بڑی جماعت کے ان امور کی رعایت نہ کرنے کی بنا پر جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جانے کا اندیشہ تھا، لیکن چونکہ یہ ساری باتیں تاکیداً تفصیلاً کتاب اللہ سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے حضرت عمرؓ نے اس نور فراست سے جو خدا نے ان کو عطا کیا تھا اپنی صائب رائے سے یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپؐ کا مقصد و مدعا کیا ہے اس لیے وہ آپ کی اس شدید تکلیف کی وجہ سے جس میں آپؐ مبتلا تھے، آپؐ کو مزید زحمت

میں ڈالنے کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

موقع و محل اور دوسرے قرائن سے بھی اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی کہ آپ حضرت علیؓ کے لیے خلافت نامہ تحریر فرمانا چاہتے تھے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا آپ حکم دے چکے تھے، اور تمام صحابہؓ نے ان کی اقتدا میں نماز ادا کی تھی، اس سے بطریق لزوم خود ہی ثابت ہوجاتا ہے کہ آپ خلافت کبریٰ کے منصب پر بھی انھی کو فائز کرنا چاہتے تھے، اس لیے اگر آپ ان کی خلافت کی صراحت فرمانا یا ان کے لیے وصیت تحریر کرنا چاہتے رہے ہوں تو یہ ایک قریبی احتمال ہے، اور وہ احتمال جو بیان کیا جاتا ہے بعید تر ہے، کتاب الجہاد کے باب ھل یستشفع الی اھل الذمۃ میں شارح قسطلانی تحریر کرتے ہیں کہ آپ نے کاغذ یہ تحریر فرمانے کے لیے مانگا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی صراحت فرمادیں لیکن چونکہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑے اور آپ کو بیماری کی شدید تکلیف تھی اس لیے آپ نے اس کی جانب سے اس لیے صرف نظر کرلیا کہ آپ حضرت ابوبکرؓ کو نماز میں اپنا جانشین بنا ہی چکے تھے، امام بخاریؒ کتاب الطب کے باب المریض میں آپ کے اس ارشاد گرامی کو نقل کرتے ہیں:

لقد ھممت او اردت	میں نے قصد یا ارادہ (راوی
ان ارسل الی ابی بکر	کو شک ہے کہ ھممت فرمایا، یا
وابنہ۔	اردت) کیا کہ ابوبکر اور ان کے
...	صاحبزادے (عبدالرحمٰن) کو بلاؤں

امام مسلم کی روایت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ

واعھد ان یقول	اور ان کے لیے خلافت کی وصیت
القائلون و یتمنی	کردوں تاکہ کسی کو اس (خلافت) کی
المتمنون۔	طلب و تمنا نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے سوا کسی اور کو میرے بعد خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، یہ مفہوم چونکہ دوسری حدیثوں کے منطوق کے مطابق ہے اس لیے اس باب میں یہ مختصر حدیث بیان کرنے پر اکتفا کی ہے، امام مسلم حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تاکہ میں انکے لیے یہ تحریر کردوں، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے دعوے دار ہوجائیں گے اور اپنے کو خلافت کا زیادہ اہل بتائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اور تمام مسلمان حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے پر راضی نہ ہوں گے، بزار حضرت عائشہؓ کے واسطے سے یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ جس وقت آپ کے مرض نے شدت اختیار کرلی تھی، اس وقت آپ نے فرمایا کہ دوات، قلم اور کاغذ لاؤ تاکہ میں ابوبکر کے لیے ایک تحریر لکھ دوں، تاکہ لوگ اس معاملہ میں ان سے اختلاف نہ کریں، پھر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خدا کی پناہ اس بات سے کہ لوگ ابوبکر سے اس معاملہ میں اختلاف کریں۔

یہاں یہ شبہہ بھی ہوتا ہے کہ جو دو حدیثیں اوپر بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے پاس جو لوگ موجود تھے، انھوں نے آپ کے اس حکم کو ایجابی (واجب) نہیں سمجھا، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ امر ایجابی ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مانعین کتابت پر ناگواری ظاہر فرماتے، اور واجب کا مکلف بنانے میں کسی کی بھی پروا نہ کرتے، علاوہ ازیں خود حضرت عمرؓ کس طرح امر ایجابی کی تعمیل میں توقف فرماتے جب کہ ان کی رائے عموماً وحی قرآنی کے مطابق ہوتی تھی،

شارح نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں، جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

کتاب الجہاد کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمرؓ کی رائے پسند آئی تھی، اور آپؐ نے دوسرے لوگوں کی بات سنی ان سنی کر دی تھی، اور ان کے اعتراض کو سرے سے نظر انداز فرما دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں طعن و تشنیع ذاتی خبث اور طبعی عناد کا نتیجہ ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ (ج ۱ ص ۶۱ و ۶۲)

اسباب و وجوہ کا ذکر

شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں جا بجا کسی حدیث کو لانے کا مقصد اور احادیث میں درج باتوں کے وجوہ و اسباب اور مصالح بھی تحریر کیے ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز اس مشہور حدیث (انما الاعمال بالنیات) سے کیا ہے، شیخ نے اس کی غایت یہ بیان کی ہے کہ کتاب کا آغاز اس حدیث سے کیا جانا اس کو ظاہر کرتا ہے کہ سچی نیت اور تقرب الٰہی کے ارادے کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔

آگے وحی کی کیفیت کی تشبیہ آواز جرس سے دیے جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وحی پیہم آتی تھی اور کلمات ایک دوسرے سے منفصل اور جدا نہیں ہوتے تھے، یا اس لحاظ سے تشبیہ دی ہے کہ آسانی سے اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے، اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے نفس وحی مراد ہے، اور آواز سے فرشتے کے بال و پر کی آواز مراد ہے، جو کہ وحی کا دیباچہ و مقدمہ ہوتی تھی۔ (ص ۷)۔

اسی سلسلۂ روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ سخت ٹھنڈک کے دنوں میں بھی جب آپؐ پر وحی آتی تھی تو آپؐ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا، اس رنج و تعب کی وجہ سے جو احکام الٰہی کی تبلیغ کی ذمہ داری کو محسوس کرنے کی وجہ سے آپؐ کو پہونچتا تھا۔

وحی کے سلسلہ کی روایت میں آگے یہ بیان ہوا ہے کہ وحی کی جو پہلی نوع آپؐ پر نازل

ہوئی وہ خواب میں رویائے صالحہ تھے۔ شیخ کا بیان ہے کہ یہ کیفیت چھ ماہ تک رہی اور اس کی حکمت یہ تھی کہ فرشتہ اگر دفعۃً آجاتا اور یکبارگی بار نبوت آپ پر ڈال دیا جاتا تو آپؐ کے قوائے بشری اس کے متحمل نہ ہوتے، اور بیداری کی حالت میں آپ پر جو ہیبت طاری ہوتی اس کا ذکر اسی روایت کے آخر میں ہے۔ (ص ۷)

اس حدیث کے آخر میں حضرت ورقہ بن نوفل کے اس قول کا ذکر ہے کہ "یہ وہی ناموس ہے جس کو اللہ نے موسیٰؑ کے پاس بھیجا تھا"۔ نصرانی ہونے کے باوجود انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر کیوں کیا، اس کی وجہ شارحین یہ بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا بڑا حصہ احکام پر مشتمل ہے، اور یہی حال ہمارے پیغمبرؐ کی کتاب کا بھی ہے، اس کے برعکس حضرت عیسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی تھی وہ تمام تر امثال و مواعظ کا مجموعہ ہے، شیخ نور الحق اس توجیہ سے متفق نہیں ہیں، کیونکہ حضرت موسیٰؑ متفقہ طور پر نہایت مشہور و مقرب نبیوں میں سے تھے، اس کے برخلاف حضرت عیسیٰؑ کی نبوت میں بھی یہود کی ایک جماعت کو اختلاف تھا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت جبریلؑ حضرت موسیٰؑ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بنسبت زیادہ آتے تھے، کیونکہ توریت احکام پر مشتمل تھی اور احکام نجماً نجماً اترتے تھے جس طرح کہ قرآن احتیاج کے وقت اترتا تھا، کشاف میں ہے کہ جنی (جنات) یہودی تھے، اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کے نام کی تعیین کی گئی ہے، اور بیضاوی میں ہے کہ جنیوں کو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ شیخ نور الحق کے نزدیک یہ ساری وجہیں نہایت دور از کار ہیں، جنات تو مشرق و مغرب ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے، انھیں حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کی بھلا اطلاع کیوں نہ ہوتی (ج ۱ ص ۹ و ۱۰)

صحیح بخاری کے ابواب کی مناسبت کا ذکر

امام بخاریؒ کا ایک خاص فضل و امتیاز ان کی کتاب کے

ابواب وتراجم بھی ہیں، ان کے تحت انھوں نے جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کی مناسبت کے پہلو نہایت دقیق اور مخفی ہیں جن کی حقیقت امعان نظر کے بغیر معلوم نہیں ہوتی، اسی لیے علمائے فن نے ان کو اپنے غور وفکر کا خاص موضوع بنایا ہے، اور اپنی شرحوں میں اس پر مفصل بحث وگفتگو کی ہے، شیخ نور الحق نے بھی ابواب وکتب سے احادیث کی مناسبت جا بجا دکھائی ہے، چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

صحیح بخاری کے باب بدء الوحی کے آخر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے واسطے سے ابوسفیان وہرقل کا جو مکالمہ بیان کیا گیا ہے، شیخ نور الحق عنوان باب سے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کرتے ہیں:

"قسطلانی کے نزدیک باب مذکور سے حدیث کی مناسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں آپؐ کے ابتدائی حالات اور عمدہ صفات واطوار کا ذکر ہے جن کی وجہ سے آپؐ وحی ورسالت سے سرفراز کیے گئے، علاوہ ازیں اس روایت میں ظہور نبوت کی ابتدا کا واقعہ درج ہے، ایک جماعت کے نزدیک عنوان میں مذکور آیت سے ابوسفیان وہرقل کی گفتگو کی مناسبت اس طرح ہے کہ گذشتہ تمام انبیاء علیہم السلام کے حالات جن پر وحی نازل ہوتی تھی اسی طرح کے ہیں، واللہ اعلم۔" (ص ۱۶)

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے باب امور الایمان میں دو آیتیں لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الخ وَقَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الآية نقل کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ "ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے"، شیخ نور الحق اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"باب کے عنوان سے حدیث کی مناسبت ظاہر ہے اور پہلی آیت سے اس کی مناسبت

اس اعتبار سے ہے کہ یہ آیت تمام انسانی فضائل وکمالات کی جامع ہے، یہ سب کمالات اپنے انواع وشعب کے ساتھ ان تین قسموں کے اندر منحصر ہیں: (۱) صحت اعتقاد (۲) حسن معاملہ (۳) تہذیب نفس، مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ سے وَالنَّبِيّٖنَ تک میں پہلی قسم کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اور دوسری کی طرف وَاٰتَى الْمَالَ سے وَفِى الرِّقَابِ میں اشارہ کیا گیا ہے، اور اَقَامَ الصَّلٰوةَ الخ میں تیسرے امر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے اس آیت پر عمل کیا اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا، اگر تفصیل وتحقیق سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمان کی ساٹھ سے زائد شاخیں بھی انھی تینوں انواع کے اندر داخل ہیں۔

دوسری آیت سے مناسبت میں بھی کوئی خفا نہیں ہے، کیونکہ یہ بات تو بالکل صریح اور واضح ہے کہ ایمان کامل متعدد صفات کے مجموعہ کا نام ہے، یہ توجیہ اس صورت میں ہے جب یہ مانا جائے کہ آیتیں بھی عنوان باب میں داخل ہیں، لیکن اگر یہ مانا جائے کہ آیتیں محض عنوان کی تائید کے طور پر لائی گئی ہیں تو پھر آیات سے حدیث کی تطبیق شرح وبیان کی محتاج نہیں" (ص ۱۸، ۱۹)

کتاب الایمان کے ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ "خوف المؤمن ان یحبط عمله وھو لا یشعر" (مسلمان کا اس بات سے اندیشہ کہ اس کا عمل ضائع ہو جائے، درآں حالیکہ اس کو اس کا پتہ نہ ہو) مصنف نے اس باب میں بعض آثار نقل کرنے کے بعد دو حدیثیں بیان کی ہیں، پہلی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ "مومن کو گالی دینا اور اس سے قتال کرنا کفر ہے"، اور دوسری حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شب قدر کی خبر دینے کے لیے باہر تشریف لائے، مگر دو مسلمان لڑ پڑے، اس کی وجہ سے شب قدر اٹھا لی گئی، ممکن ہے تمھارے لیے یہی بہتر ہو، اس لیے تم اسے ۲۷، ۲۹ اور ۲۵ کی رات میں تلاش کرو۔

شیخ نور الحق ارشاد فرماتے ہیں کہ مولف نے اس باب میں دو باتوں کو عنوان بنایا ہے (۱) خوف المؤمن الخ (۲) مایحذر من الاصرار علی التقاتل والعصیان من غیر توبۃ (بغیر توبہ لڑائی اور گناہ پر اصرار کی تحذیر و وعید)، شارحین نے پہلے قول سے ان دونوں حدیثوں کی مناسبت کے بارے میں کہا ہے کہ پہلی حدیث "سباب المؤمن وقتالہ کفر" کو خوف المؤمن الخ سے مکمل مناسبت ہے، بعض شارحین پہلی بات سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں وارد ہے کہ مسلمان اپنی آواز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر بالا نہ کریں کہ یہ حبط اعمال کا موجب ہو جائے، اور چونکہ اختلاف اور جھگڑے میں بھی آواز کے بلند ہونے کی بات تھی اس لیے اس میں بھی حبط عمل کا اندیشہ ہے (ج ۱ ص ۳۴)

کتاب الایمان کے باب المعاصی من امر الجاھلیۃ ولا یکفر صاحبہا (گناہ جاہلیت کے امور میں داخل ہے، اور گناہگار کی تکفیر نہ کی جائے گی) میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل کی ہے جس میں ایک شخص کو ان کے گالی دینے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انک امرء فیک جاھلیۃ (تم ایسے شخص ہو جس میں جاہلیت کی خو بو ہے) اس کے متعلق شیخ لکھتے ہیں:

"عنوان سے حدیث کی مناسبت اس قدر ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر شخص سے بھی گناہ سرزد ہوا اور اس کے باوجود وہ مسلمان رہے، (ص ۲۶)

کتاب العلم کے باب المناولۃ میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اپنا نامۂ مبارک دے کر بھیجا، اس نے جب نامۂ مبارک کسریٰ کے حوالہ کیا تو اس نے اسے چاک کر ڈالا۔

شیخ نے ترجمۃ الباب سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خط قاصد کے سامنے پڑھے بغیر اس کے حوالہ کر دیا، اور اسے اس کی اجازت دی

کہ وہ یہ کہے کہ یہ نامۂ مبارک ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیے، مناولت اور اجازت کا یہی ثمرہ اور حاصل ہے۔ (ج ۱ ص ۴۴)۔

اسی کتاب کے باب من ترك بعض الاختيار مخافة ان يقصر فهم بعض الناس عنه فيقعوا فی اشد منه (جو کسی مختار اور پسندیدہ کام کو اس اندیشہ سے ترک کر دے کہ بعض لوگ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے سخت تر بات میں پڑ جائیں) میں امام بخاریؒ یہ حدیث لائے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا زمانہ جاہلیت کے دور سے قریب تر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو توڑ کر اس کے دو دروازے کر دیتا تاکہ ایک سے لوگ اس میں داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے، شیخ نور الحق فرماتے ہیں کہ عنوان باب سے حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائے کعبہ کے سلسلے میں ایک مختار امر کو اس اندیشہ کی وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ ضعیف الایمان لوگوں کے فتنہ میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ (ج ۱، ص ۶۸)۔

شیخ نور الحق نے احادیث سے ترجمۂ ابواب کی مناسبت ہی نہیں بیان کی ہے، بلکہ کتب و ابواب کی باہمدگر مناسبت بھی بیان کی ہے، کتاب الوضوء کے شروع میں لکھتے ہیں:

"مصنف نے کتاب کا آغاز وحی کی حدیثوں سے کیا تھا جو دینی احکام کا منبع اور سرچشمہ ہے، اس کے بعد ایمان کی حدیثیں لائے ہیں، جو تمام احکام کی اصل و بنیاد ہے، اس کے بعد علم سے متعلق حدیثیں بیان کی ہیں، اس لیے کہ احکام اسی سے وابستہ ہوتے ہیں، پھر احکام و عبادات کا بیان شروع ہوتا ہے، جن میں نماز کا ذکر دوسری عبادتوں سے پہلے کیا ہے کیونکہ یہ تمام عبادات سے افضل ہے اور نماز سے بھی پہلے طہارت کی حدیثیں بیان کی ہیں، کیونکہ یہ نماز کی تمام شرطوں میں سب سے اہم اور بڑی شرط ہے، ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے مقدم ہوتی ہے (ج ۱ ص ۷۰)

شیخ نور الحق، صحیح بخاری کے نسخوں کے فرق و اختلاف کو بھی واضح کرتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے تراجم ابواب کے اس فرق کو بھی دکھایا ہے جو مختلف نسخوں میں پایا جاتا ہے، اس ضمن میں بھی انھوں نے کہیں کہیں احادیث سے تراجم ابواب کی مناسبت دکھائی ہے، مثلاً امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے باب علامات الایمان حب الانصار (ایمان کی علامتوں میں انصار کی محبت بھی ہے) کے بعد جس باب کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی عنوان نہیں دیا ہے، شیخ نور الحق کا بیان ہے کہ بعض نسخوں میں یہاں سرے سے باب ہی موجود نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب میں مذکور حدیث کا تعلق سابق باب علامات الایمان سے ہوگا، اور پھر حدیث کی اس سے مناسبت واضح کی ہے (ص ۲۰ و ۲۱)

کتاب الایمان کے ایک باب کا عنوان یہ ہے "باب المعاصی من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها بارتكابها الا بالشرك" (گناہ کے کام جاہلیت کے کاموں میں سے ہیں جن کے مرتکب کی تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے شرک کے گناہ کے) اس باب کے آخر میں حضرت ابو بکرہؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے قتال کریں تو قاتل و مقتول دونوں آگ میں ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ خیر یہ تو قاتل ہے، لیکن مقتول کیوں آگ میں جائے گا، آپ نے ارشاد فرمایا: اس لیے کہ وہ بھی اپنے حریف کو قتل کرنے کا آرزومند تھا۔

شیخ نور الحق اس حدیث کی شرح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "یہ کتاب کے بعض نسخوں میں علیحدہ باب میں درج ہے جس کا عنوان یہ ہے وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑائی کریں تو ان کے درمیان صلح کراؤ) اس شرح میں اس نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو ہمارے شیخ و سید ابو المجد عبد الحق کا تصحیح کیا ہوا ہے (ج۱ ص ۲۷)

شیخ نے نسخوں کے الفاظ و حروف تک کے فرق و اختلاف کو بھی بتایا ہے، جیسے کتاب الایمان کے شروع ہی میں بتایا ہے کہ صحیح بخاری کے بعض نسخوں کی روایات کے مطابق اس کے بجائے من کتاب الایمان مذکور ہے، مگر ان کے نزدیک زیادہ صحیح روایت وہ ہے جس کو انھوں نے اختیار کیا ہے، اس کے معاً بعد امام صاحب جو باب لائے ہیں وہ یہ ہے باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شیخ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عنوان اس طرح ہے باب الایمان و قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مگر مختار اول ہے۔

اس باب میں امام بخاریؒ نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان میں دوسری آیت وَزِدْنَاهُمْ هُدًى کے متعلق شیخ دہلوی نے لکھا ہے کہ "ہم کو کسی نسخہ میں اس آیت سے پہلے قال اللہ نہیں ملا نیز بعض نسخوں سے یہ آیت ساقط ہے، اس صورت میں اس باب میں یہاں کل سات ہی آیتیں ہوں گی" (ص ۱۶ و ۱۷)

امام بخاریؒ نے بعض ابواب میں کوئی حدیث نہیں بیان کی ہے، بلکہ چند آیتیں نقل کر دی ہیں، مثلاً کتاب العلم کا پہلا باب فضل العلم (علم کی فضیلت) قائم کیا ہے، اور اس میں دو آیتیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور کوئی حدیث نہیں درج کی ہے، شیخ نور الحق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ زیر نظر باب میں ان کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی ہے، اس لیے انھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ آیتوں کو نقل کر دیں، کیونکہ یہ سب سے بڑی دلیل اور صریح ثبوت ہیں۔ (ج۱ ص ۴۰)

شکوک و شبہات کا جواب | شیخ نور الحق نے منافقین کے استغفار کے مسئلہ پر بڑی مفصل بحث کر کے اس کے متعلق شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے، پہلے وہ حدیث ملاحظہ ہو جس کے ضمن میں یہ بحث کی گئی ہے:

عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول مجھے اپنی قمیص عطا کیجیے تاکہ میں اسے
اپنے باپ کا کفن بناؤں اور ان کے جنازہ کی نماز پڑھیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے، چنانچہ آپ نے
ان کو اپنی قمیص دے دی، اور فرمایا کہ جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے بتلانا تاکہ میں نماز پڑھوں، پس جب
انھوں نے خبر دی اور آپؐ نے نماز کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کا دامن کھینچ لیا اور کہا، کیا
اللہ نے آپؐ کو منافقین کی نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے دونوں کا اختیار
دیا گیا ہے

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ	آپ منافقین کے لیے استغفار کیجیے یا
اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً	نہ کیجیے، اگر آپ ان کے لیے ستّر بار
فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ .	بھی استغفار کریں تو اللہ ہرگز ان کی مغفرت
(توبہ : ۸۰)	نہیں کرے گا۔

چنانچہ آپؐ نے ان کی نماز پڑھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی :

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ	منافقین میں سے اگر کوئی مر جائے تو
مَاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ	آپؐ کبھی نہ اس کی نماز پڑھیں اور نہ
(توبہ : ۸۴)	اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

اس حدیث کے متعلق دل میں کچھ خلجان پیدا ہوتا ہے جس کو رفع کرنا ضروری ہے۔
ابن ابی کے صاحبزادے اسلام کے مخلص و فدائی تھے، انھیں اپنے والد کے نفاق اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام سے ان کی شدید عداوت کا علم تھا، ان کو اہل نفاق کی
تکفیر و تقبیح اور سوء عاقبت سے متعلق نصوص سے بھی پوری واقفیت تھی اسی بنا پر جب ان کے
کانوں میں ان کے والد کے یہ الفاظ پڑے کہ "ہم جیسے ہی مدینہ پہونچیں گے تو ہم عزت والے لوگ

ان ذلیل و خوار لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے" تو برسر راہ انھوں نے باپ کو پکڑا اور تلوار کھینچ لی
کہ آپ یہ کہیے کہ ہم جیسے لوگ ذلیل و خوار ہیں اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی تمام لوگوں
سے زیادہ معزز و برتر ہیں، اگر آپؐ یہ نہیں کہیں گے تو اسی تلوار سے آپ کا سر آپ کے تن سے جدا کر دوں گا
چنانچہ جب تک ان سے اس کا اقرار نہ کرالیا انھیں نہیں چھوڑا۔
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس طرح کی فرمائش کیوں کی؟ دوسرا اشکال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس منافق کے
حال سے قطعی طور پر واقف تھے، اس کے باوجود آپ نے کس طرح اس کے لیے درخواست کو منظور کیا
جب کہ اس سے پہلے ابو طالب کی وفات کے بعد مکہ ہی میں یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ	نبیؐ اور مسلمانوں کے لیے زیبا نہیں ہے کہ
يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (توبہ ۱۱۳)	وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے، آپ عربی زبان کے استعمال کے
سب سے بڑھ کر عارف اور اللہ کی مراد و منشا کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ایسی صورت میں اِسْتَغْفِرْ
لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سے استغفار و عدم استغفار میں تخییر کا مفہوم آپ نے کیسے سمجھ لیا؟
مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں مراد اس برابری سے ہے جو ان دونوں امور کے غیر مفید ہونے میں ہے
جیسا کہ آیت میں تصریح کہا گیا ہے کہ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ
(اگر آپؐ ان کے لیے ستّر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا)
شیخ فرماتے ہیں کہ قسطلانی نے خلجان کو دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا ہے، ہم اس کے
بعض مقدمات کو جو اس وقت ذہن میں اور نوک قلم پر آرہے ہیں اللہ کی توفیق سے قلمبند کرتے ہیں
ابن ابی کی ظاہری حالت اہل اسلام کے مطابق تھی اور ان کے صاحبزادے راسخ العقیدہ

مسلمان تھے، ان کو اپنے والد کے عام حالات کی وجہ سے ایک طرح کی پشیمانی اور ندامت رہتی تھی، انھی احساسات وجذبات نے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی خواہش کے اظہار پہ آمادہ کیا ہوگا کہ آپؐ کے ظاہری وباطنی برکات ایمانی اور مغفرت کی دعا سے ان کے والد محروم نہ رہیں، عبدالرزاق نے قتادہؓ سے روایت کی ہے کہ خود ان کے والد نے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ التماس کرنے کے لیے بھیجا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بندگان خدا سے شدید محبت ورافت کی بنا پر ان کی ہدایت کے نہایت حریص اور مشتاق رہتے تھے، نیز آپؐ کو ابن ابی کے صاحبزادے سے بڑا تعلق خاطر بھی تھا، اس لیے آپؐ تشریف لے جانے کے لیے تیار ہو گئے، اور ان کے صاحبزادے سے فرمایا کہ یہودی کی محبت نے تجھے ہلاک کیا، انھوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میں تو فرستادہ ہوں، آپ میری خاطر سے استغفار فرما دیجیے، اور اپنا پیراہن مبارک کفن کے لیے عطا کیجیے اور میری سرزنش نہ کیجیے، فتح الباری میں اس حدیث کو مرسل مگر اس کے تمام رجال کو ثقہ کہا گیا ہے، اس کی تائید طبرانی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ابن عباس کے واسطے سے مروی ہے کہ جب ابن ابی بیمار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھ پر احسان کیجیے، میری تکفین کے لیے اپنا پیراہن عطا کیجیے اور میری نماز جنازہ ادا کیجیے۔

شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کی ان گذارشات نے ان کی موت کے بعد ان کے لڑکے اور خاندان والوں کے شرم وعار کو ختم کر دیا، کیونکہ انھوں نے اخبات اور انقیاد کا ارادہ کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ظاہری حالات دیکھ کر ان کی جانب رغبت ہو گئی، مگر جب یہ وحی نازل ہوئی کہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا تو آپؐ کو تنبہ ہوا اور آپؐ پر سارے حالات منکشف ہو گئے، قسطلانی کے خیال میں اس واقعہ کے تعلق سے یہ بہترین جواب ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عباسؓ کو غزوۂ بدر میں برہنہ قیدی بنا کر لایا گیا اور کوئی کپڑا موجود نہ تھا جو ان کی قامت پر راست آتا تو عبداللہ ابن ابی نے جو ان کا ہم قامت تھا انھیں اپنا کپڑا پہنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بدلے میں اپنا پیراہن اس کو دیا تاکہ منافق کا کوئی احسان آپؐ پر نہ رہ جائے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص بھی سوال کرتا تھا تو آپؐ نہیں نہ کہتے تھے، اور یہاں تو سوال کرنے والے ایک مخلص مسلمان تھے، پھر پیراہن دینے میں بخل سے کام لینا آپؐ کے کرم وسخاوت کے منافی تھا، اس لیے آپ کو پیراہن دینے میں کوئی تامل نہیں ہوا، چنانچہ جو آیت بعد میں نازل ہوئی اس میں آپؐ کے پیراہن کی بخشش کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آیت کریمہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ الخ اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور اس میں نماز جنازہ کے بجائے صرف استغفار کی ممانعت ہے تو اوپر بیان کی گئی توجیہ سے خلجان کیسے دور ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس استغفار سے منع کیا گیا ہے جس کی اجابت کی امید ہو، اور جو واقعۃً تحصیلِ مغفرت کی غرض سے کیا گیا ہو، حضرت ابوطالب کے معاملہ میں آپؐ نے اسی لیے استغفار کیا تھا، لیکن اس منافق کے لیے آپؐ نے جو استغفار کیا تھا اس کا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ اس کے صاحبزادے اور اہل خاندان کی تالیفِ قلب اور دلجوئی کے لیے کیا تھا، روایت کی گئی ہے کہ اس کریمانہ خلق نبویؐ کا مشاہدہ کر کے خزرج کے ایک ہزار آدمی ایمان سے مشرف ہو گئے تھے، اور انھوں نے کہا کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف وکرم اور دعا واستغفار کا یہ حال ایک ایسے شخص کے ساتھ ہے جو زبان سے تو اسلام ظاہر کرتا تھا لیکن اندر سے اس کے برعکس تھا تو جن کا ظاہر وباطن یکساں

اور جو واقعی ایمان و اسلام میں مخلص ہوں ان کے ساتھ آپ کا برتاؤ کتنا عمدہ اور اچھا ہوگا

جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے اس کی نماز اس لیے پڑھی تھی کہ آپ امت کو تعلیم دینا چاہتے تھے کہ احکام شرع ظواہر حال پر مترتب ہوتے ہیں، چنانچہ جس نے اقرار شہادت کرلیا اس پر باتفاق احکام جاری ہوں گے، رہی آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ الخ جو اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی تو یہ ان منافقین کے لیے مخصوص ہے، جن کے کفر کا یقین آپؐ کو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے کی وجہ سے ہوگیا تھا۔

آگے شیخ نورالحق نے آیت استغفار سے آنحضرتؐ کے تخییر کا مفہوم لینے پر جس تردد اور خلجان کا اظہار کیا گیا ہے اس کا جواب دیا ہے مگر یہ جواب خود ان کے نزدیک بھی شافی اور دشواری سے خالی نہیں ہے۔

اس طرح کے شکوک و شبہات کا جواب انھوں نے اور جگہوں پر بھی دیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب علامات المنافق میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں (۱) جب کوئی بات کرے تو جھوٹ کہے (۲) وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے (۳) جب کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے

شیخ نورالحق اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اوصاف بد تو مومنین میں بھی پائے جاتے ہیں پس ان کو نفاق کی علامت کیسے مانا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ان اوصاف بد کو اپنی عادت بنالیں اور یہ حالات ان کے لوازم میں داخل ہوجائیں وہ مخلص مومن نہیں ہیں، بلکہ پکے منافق ہیں، جیسا کہ دوسری حدیث اس مفہوم میں بالکل صریح ہے۔

یہ جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ یہ عادتیں نفاق کی علامت ہیں، جس شخص میں جمع ہوجائیں

ظاہر حکم کے مطابق اس کے اندر نفاق کی علامتیں جمع ہوگئیں، رہی دل کی تصدیق تو اس کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نفاق سے عمل میں نفاق مراد ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ لغت میں باطن سے ظاہر کی مخالفت کا نام نفاق ہے، اگر یہ مخالفت ایمان و عقیدہ میں ہو تو اسے نفاق کفر کہا جائے گا، ورنہ نفاق عمل کہلائے گا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ عمل عقیدہ کے مطابق نہیں ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حدیث کسی متعین اور خاص شخص کے بارے میں ہے جو منافقین کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپؐ اشارہ و کنایہ میں گفتگو کرتے تھے مثلاً فرمایا ما بال اقوام، اسی طرح کے اور فرمودات بھی ہیں۔

یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ جس طرح اخلاص کے مقامات و درجات ہیں اسی طرح اس کے مقابل نفاق کے بھی مراتب و درجات ہیں، چونکہ ان صفات کے ہوتے ہوئے آدمی کمال اخلاص کے مرتبہ پر نہیں پہونچ سکتا اور جب ان مذموم باتوں میں وہ بہت آگے نکل جائے تو منافق کہلائے گا، اسی کی طرف حدیث نافق حنظلة الخ میں بھی اشارہ ہے (ج ۱ ص ۲۷)

اصول و مصطلحات حدیث کی تشریح

شیخ نورالحق نے جابجا احادیث کے اصول و مصطلحات پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، یہاں ہم بعض مثالوں سے اس کو واضح کریں گے، محدثین کی ایک اصطلاح متابعت ہے، اس کے متعلق شیخ کی وضاحت کو سمجھنے کے لیے یہ پس منظر پہلے جان لینا چاہیے۔

امام بخاریؒ نے کتاب کے پہلے باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جو تیسری حدیث نقل کی ہے اس کی سند ملاحظہ ہو:

حدثنا یحیی بن بکیر قال اخبرنا اللیث عن عقیل عن ابن شهاب
عن عروة بن الزبیر عن عائشة ام المؤمنین رضی الله عنها انها
قالت اول ما بدئ به رسول الله صلی الله علیه وسلم من الوحی الخ

حدیث کو ختم کرنے کے بعد امام بخاری فترۃ الوحی کے متعلق ابن شہاب کے
واسطے سے جابر ابن عبداللہ انصاریؓ کی حدیث کے بعض حصے نقل کر کے لکھتے ہیں:

تابعه عبد الله بن یوسف وابو صالح.	عبداللہ ابن یوسف اور ابو صالح نے یحییٰ ابن بکیر کی متابعت کی ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

وتابعه هلال بن رداد عن الزهری.	زہری سے روایت کرنے میں عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے کی ہے

اس کے بعد شیخ نور الحق کی تقریر ملاحظہ ہو:

"اہل حدیث کی اصطلاحات میں ایک متابعت بھی ہے، مصنف نے اپنی جامع میں
اس سے اکثر تعرض کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی نے ایک روایت اپنے شیخ سے کی
اور اسے کسی دوسرے شخص سے بھی بیان کیا جس نے اس کے شیخ کے شیخ سے اسی کو روایت
کیا ہے، اب اگر یہ دوسرا راوی معتبر ہے اور صحابی تک اس کی سند کے تمام رُواۃ متفق علیہ
ہیں تو اس قسم کو متابعت تامہ (مکمل متابعت) کہتے ہیں، مثلاً امام بخاری نے اس روایت کو
یحییٰ کے واسطے سے بیان کیا ہے اور انھوں نے اسے لیث کے واسطے سے بیان کیا ہے
اور اس کی تائید عبداللہ و ابو صالح کی روایت سے کی ہے جو معتبر و متفق علیہ ہیں، متابعت کی
دوسری قسم یہ ہے کہ جو راوی اس کی روایت کی تائید کرتا ہے وہ شیخ کے شیخ سے روایت کرنے میں

اوپر کے راوی کا شریک ہے، اس کو متابعت ناقصہ کہتے ہیں، اگر یہ دور تر ہو تو متابعت
نقص کہلائے گی، اس اعتبار سے کہ بعض رجال نے اس کی عدم موافقت کی ہے جیسا کہ مصنف نے
دوسری بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہا ہے کہ عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے
کی ہے، یعنی جس طرح عقیل نے ابن شہاب سے روایت کی ہے جو تابعی ہیں اسی طرح
ان سے ہلال بن رداد نے بھی کی ہے، اور چونکہ ہلال و عقیل ابن شہاب سے روایت
کرتے ہیں، اس لیے بلا شبہ ہلال کی روایت عقیل کی روایت کی متابع ہوئی۔

متابعت میں بعض لوگوں نے یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ متابعت کرنے والے دونوں
افراد کے متن کو لفظاً متحد ہونا چاہیے، مگر کچھ لوگ صرف معنی کے اتحاد کو کافی سمجھتے ہیں،
متابعت کو شاہد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔" (ج ۱ ص ۱۰ و ۱۱)

محدثین کی ایک اصطلاح تعلیق ہے جس کی مثالیں صحیح بخاری میں بکثرت ملتی ہیں
شارح نے کہیں کہیں اس کی نشاندہی کی ہے، مثلاً کتاب الایمان میں باب الصلوٰۃ من
الایمان (نماز ایمان میں شامل ہے) کا باب باندھا ہے، اور اس میں جو حدیث
نقل کی ہے اس کے خاتمہ سے قبل لکھا ہے: قال زهیر حدثنا ابو اسحاق
عن البراء فی حدیثه هذا اور اس کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ مقولہ بھی اسی حدیث
کا جز ہے جو سند مذکور سے وارد ہے، مگر ان کے نزدیک اس کا بھی احتمال ہے کہ مصنف
اسے زہیر کے واسطے سے بطریق تعلیق لائے ہوں (ج ۱ ص ۳۰)

ایک جگہ تعلیق کی نشاندہی کر کے اس کا مفہوم مثال سے واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:
"تعلیق کا مطلب یہ ہے کہ راوی حدیث کو ایسے شخص کی طرف منسوب کرے جس کا زمانہ
اسے نہ ملا ہو، چنانچہ امام بخاریؒ نے حدیث مذکور کی طرف دو دیگر طرق سے جو کہ تعلیقات ہیں

ہیں اشارہ کیا ہے، جیسے ابو معاویہ نے ۱۹۵ھ یا ۱۹۴ھ میں وفات پائی اور عبدالاعلیٰ نے ۱۸۹ھ میں جبکہ امام بخاریؒ کی ولادت ۱۹۴ھ میں ہوئی۔" (ج ا ص ۱۹)

ایک جگہ وہ امام بخاریؒ کے اس طریقہ تخریج حدیث کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں اس بنا پر لاتے ہیں کہ ہر ہر باب سے اس کی مناسبت جزءً ہوتی ہے، محدثین کی اصطلاح میں ایک ہی متن اگر متعدد طرق سے آئے اور ایک راوی بھی اس کی پوری سند میں متغایر ہو تو اسے "دو حدیث" کہا جائے گا، یہ حدیث اسی قبیل سے ہے جس کو مولف نے ایک بار قتیبہ اور انھوں نے اسماعیل کے واسطے سے بیان کیا ہے اور دوسری مرتبہ خالد سے جو اسے سلیمان سے بیان کرتے ہیں' لائے ہیں۔" (ج ا ص ۴۲)

کہیں کہیں ان حدیثوں کو جنھیں امام بخاریؒ نے بلا سند نقل کیا ہے، شیخ نورالحق نے بتایا ہے کہ انھیں کس مصنف نے سنداً نقل کیا ہے، مثلاً کتاب الایمان کے پہلے باب کی اس حدیث الحب فی اللہ والبغض فی اللہ عز وجل من الایمان (اللہ کیلئے حب و بغض ایمان میں داخل ہے) کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"مصنف اس حدیث کو سند کے بغیر لائے ہیں، لیکن ابو داؤد نے اسے ابو امامہ کے واسطے سے اور امام ترمذی نے معاذ بن جبل کے واسطے سے بیان کیا ہے۔" (ج ا ص ۱۷)

شارح نے سلسلۂ سند میں مذکور عطف و معطوف کی وضاحت کی ہے، مثلاً کتاب الایمان کے باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ (ایمان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے) کی پہلی سند یہ ہے: حدثنا مسدد قال حدثنا یحییٰ عن شعبۃ عن قتادۃ عن

انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن حسین المعلم حدثنا قتادۃ عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، اس پر شیخ نورالحق وعن حسین المعلم کے

بارے میں لکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا عطف شعبہ پر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ یحییٰ کو یہ حدیث دو شیوخ شعبہ و حسین معلم سے پہونچی ہے، اور یہ دونوں حضرات اسے قتادہؓ سے بیان کرتے ہیں، مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا عطف حدثنا مسدد پر ہے اس طرح یہ حدیث تعلیق کے قبیل کی ہوگی (ج ا ص ۱۹ و ۲۰)

امام بخاریؒ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی وہ حدیث کا متن پہلے بیان کرتے ہیں اس کے بعد اس کی سندوں کو لاتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ حدیث کی سندیں ضعیف ہیں، مثلاً کتاب العلم کے ایک باب کا عنوان یہ ہے من خص بالعلم قوماً دون قوم کراھیۃ ان لایفھموا (جو شخص علم کے معاملہ میں تخصیص سے کام لے اور کچھ لوگوں کو اس سے واقف کرے اور کچھ لوگوں کو اس اندیشہ سے نہ مطلع کرے کہ وہ اسے نہ سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جائیں گے) امام بخاریؒ نے اس میں پہلے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے؛

حدثوا الناس بما	لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جن سے
یعرفون، اتحبون	وہ مانوس اور واقف ہوں اور وہ انکی
ان یکذب اللہ ورسولہ	فہم سے بالا نہ ہوں، کیا تم لوگوں کو اللہ
	اور اس کے رسول کا جھٹلایا جانا پسند ہے؟

...

اس کے بعد وہ اس کی یہ سند بیان کرتے ہیں: حدثنا عبیداللہ بن موسیٰ عن معروف بن خربوذ عن ابی الطفیل عن علی رضی اللہ عنہ بذلک۔

اس کے متعلق مولانا نورالحق تحریر فرماتے ہیں:

"مصنف حدیث مذکور کا متن اس کی سند سے پہلے لاکر یہ متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اسکی

سند میں ضعف ہے، ابن معین نے خربوذ کو ضعفاء میں شریک کیا ہے، بعض حدیثوں کو انھوں نے ابواب کا عنوان قرار دیا ہے گو یہ صحیح ہیں، مگر ان کی سندیں امام بخاریؒ کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے انھیں بھی اسی انداز پر لائے ہیں، یہ حدیث اور اس کی سندیں اسی نوعیت کی ہیں۔" (ج ۱، ص ۶۸)

بعض جگہ راویوں کے کچھ اہم خصوصیات بھی شیخ نور الحق نے بیان کیے ہیں، مثلاً کتاب الایمان کے باب المعاصی من امر الجاهلية ولا يكفر صاحبها (ص ۲۵) کے ضمن میں حضرت ابوذرؓ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ اکابر صحابہ میں تھے اور ان کا مسلک یہ تھا کہ ضرورت سے زیادہ مال و اسباب کا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔" (ج ۱، ص ۲۶)

آگے چل کر ایک راوی ابوبکرہ کے متعلق رقمطراز ہیں "یہ بھی صحابی ہیں اور مصنف نے ان سے چودہ۱۴ حدیثیں روایت کی ہیں۔ (ایضاً)

زبان کے اسلوب، بلاغت اور عربیت کے مباحث

شیخ نور الحق عربی زبان و ادب کے بھی ماہر تھے، اس لیے اس شرح میں جا بجا زبان کے اسلوب و استعمال اور بلاغت و عربیت کے نکتوں کو بھی واضح کرتے گئے ہیں، جیسے کتاب الایمان کے باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقة میں حضرت سعدؓ کے واسطے سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے، جس میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اعطى رهطاً وسعد جالس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو عطا کیا اس حال میں کہ سعد بھی بیٹھا ہوا تھا۔

شیخ نور الحق فرماتے ہیں کہ سعدؓ جالس خود حضرت سعدؓ کا قول ہے، اپنے آپ کو اس طرح ذکر کرنا اور اپنے نام کی صراحت کرنا بطریق التفات ہے۔ (ص ۲۴)

تَرِبَتْ يَمِيْنُكَ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ عربوں کا مالوف طریقۂ استعمال ہے، اس سے مقصود بد دعا نہیں ہے بلکہ یہ اسلوب زجر کے لیے آتا ہے (ج ۱ ص ۶۹)

ابواب الاستسقاء کے باب ما قیل فی الزلازل والآیات میں ایک فقرہ یتقارب الزمان آیا ہے، یعنی قیامت نہ ہوگی یہاں تک کہ زمانہ نزدیک ہونے لگے، اس کے متعلق شیخ نور الحق لکھتے ہیں:

"تقارب زمان کنایہ ہے بے برکتی و بے فیضی اور اس بات سے کہ لوگ اچھے کاموں سے بے بہرہ ہو جائیں گے، یا کثرت ہموم اور بہت زیادہ حوادث و شدائد سے بھی کنایہ ہو سکتا ہے ... اور یہ جو جامع ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ سال جب ماہ اور ماہ ہفتہ اور ہفتہ دن اور دن گھنٹہ اور گھنٹہ لحظہ کی طرح ہو جائے تو یہ بھی اسی معنی میں ہے، لیکن حقیقت پر اسے محمول کرنا خفا سے خالی نہیں ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقارب زمان سے رات و دن کا برابر ہونا مراد ہے، یعنی دنیا کے آخری دور میں روز و شب میں یہ تفاوت نہ ہوگا، اور اس کی کثرت آخرت کی علامتوں میں سے ہے، بعض لوگوں کے نزدیک اس سے مراد دنیا کی مدت کا آخر ہونا ہے۔"

کتاب الایمان کی ایک حدیث میں ہے کہ جس کے اندر چار باتیں ہوں وہ خالص منافق ہوگا، یعنی اس کے اندر ایمان کی خو بو نہ ہوگی، شیخ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ بظاہر آپ کا یہ ارشاد تہدید و تشدید کے لیے آیا ہے، ورنہ اہل ایمان کا حال سخت دشوار ہو جائے (ص ۲۰۸)

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شیخ نے کہیں کہیں لفظوں کی تحقیق بھی کی ہے، جس میں

ان کے معنی بتانے کے علاوہ ان کے اعراب وحرکات کی وضاحت کی ہے اور جن لفظوں کی روایت یا ان کے معنی میں اختلاف ہے ان میں مرجح کی تصریح کی ہے، مثلاً باب بدء الوحی میں لفظ بدء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "بَدْءٌ میں بائے موحدہ پر فتحہ اور دال مہملہ پر سکون ہے اور آخر میں ہمزہ ہے جس کے معنی آغاز کے ہیں اور بُدُوٌّ کے آخر میں واؤ ہے جو مشدد ہے اور با و دال دونوں مضموم ہیں، اسکے معنی ظہور کے ہیں بدء کے علاوہ بُدُوّ کی روایت بھی کی گئی ہے، لیکن مشائخ سے مسموع بدء ہے (ج ۱ ص ۶)

ایک ہی مشتق سے بنے ہوئے لفظوں کی حقیقت وخصوصیت بیان کر کے ان کا فرق واضح کیا ہے مثلاً رؤیا کے متعلق لکھتے ہیں: "رُؤیا کا لفظ رُجعیٰ کی طرح مصدر ہے جو خواب میں دیکھنے کیلئے مخصوص ہے جس طرح رَأْی دل کے دیکھنے کے لیے اور رُؤیَۃ آنکھ سے دیکھنے کیلیے مخصوص ہے" (ج ۱ ص ۲) ناموس اور جاسوس کے معنی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "اول الذکر حضرت جبرئیلؑ سے کنایہ اور لغت میں صاحبِ سِرِّ خیر (اچھے رازدار) کے لیے آتا ہے جس طرح جاسوس صاحبِ سِرِّ شر (بُرے رازدار) کے لیے مخصوص ہے" (ج ۱ ص ۹)

جنائز کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ جنازہ کی جمع ہے جس کی جیم پر فتحہ اور کسرہ دونوں آتا ہے اور یہ اس مردہ کو کہتے ہیں جو نعش کے اندر ہو، دوسرا قول یہ ہے کہ جب جیم مفتوح ہو تو اس سے مردہ مراد ہوتا ہے اور مکسور کی صورت میں اس سے وہ نعش مراد ہے جس میں میت ہو، بعض لوگوں نے اس کے برعکس کہا ہے یعنی مفتوح سے نعش اور مکسور سے میت مراد ہے۔ (ص ۲۱)

لفظ عصابہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ عین مکسور ہے اور اس کا اطلاق ۱۰ سے ۴۰ افراد پر ہوتا ہے، اس لفظ کا واحد نہیں آتا، اسی طرح شہروں اور پہاڑوں وغیرہ کے ناموں کے تلفظ واعراب بتائے ہیں اور کہیں کہیں نحوی وصرفی بحثیں کی ہیں نیز معطوف علیہ اور معطوف کی تعیین کی ہے ۔ مقدمہ میں شیخ نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو ان کا ماخذ ہی ہیں اور جن کا ذکر اس مضمون کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار شیخ عبد الحق کی شروح وتحقیقات سے بھی بڑا استفادہ کیا ہے، ان کی کتابوں میں فتح المنان اور شرح سفر السعادۃ کے بکثرت حوالے دیے ہیں

یونانی معقولات پر ایک نظر

از

ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندوی سابق پروفیسر جامعہ ام القری مکہ معظمہ

"سو برس پہلے تحریک ندوۃ العلماء نے اصلاح نصاب کی جو صدا بلند کی تھی اس کے نتیجہ میں ان تمام مدارس کے نصاب درس میں جو ندوہ کے زیر اثر تھے دھیرے دھیرے یونانی منطق وفلسفہ کی کتابیں بہت کم ہو گئیں اور طلبہ و اساتذہ کو بھی ان کے پڑھنے پڑھانے کا شغف نہیں رہا، مگر اس فن کے اصول ومبادی سے ناآشنا ہونے کی بنا پر نہیں قدما کی کتابیں سمجھنے میں الجھن اور دشواری پیش آتی ہے، مولانا عبد اللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ و سابق پروفیسر جامعہ ام القری نے اس کمی کو محسوس کرکے اردو زبان میں فن منطق پر ایک مفید کتاب لکھی ہے جو عنقریب طبع ہوگی، اس میں اس فن کے مسائل و مباحث بہت عام فہم انداز اور سلیس وشگفتہ زبان میں لکھے ہیں، یہ مقالہ اسی کتاب کا مقدمہ ہے جس کو مولانا نے ہماری درخواست پر معارف میں اشاعت کے لیے دیا ہے اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ (معارف)

حصول علم کے دو ذرائع ہیں، ایک وہ جو انبیائے کرام کو وحی کے ذریعہ ملتا ہے اور ان کے واسطے سے عام انسانوں کے حصے میں آتا ہے یہ علم قطعی، یقینی ہر طرح کے شکوک وشبہات سے دور، پائیدار اور ٹھوس ہوتا ہے۔

لَا یَأْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ	اس میں جھوٹ کا دخل نہ آگے سے
یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ	ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) وہ دانا
مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ [۱]	خوبیوں والے خدا کی اتاری ہوئی ہے

اس علم کا کوئی سابقہ یا لاحقہ نہیں ہے، یہ کسی دلیل کا نتیجہ یا کسی برہان کا تتمہ بھی نہیں ہے وہ خود اپنی دلیل ہے

آفتاب آمد دلیل آفتاب

یہ نور مجرد ہے جسے "کم" سے تولا اور "کیف" سے پرکھا نہیں جا سکتا، یہاں تک کہ رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزول سے پہلے اس کی آگاہی نہیں ہوئی۔

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ	تم نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان
وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ	کو، لیکن ہم نے اس کو (یعنی قرآن کو)
نُوْرًا [۲]	نور بنایا ہے،

اس کے مقابلہ میں جو علم بھی ہے ظنی ہے، اٹکل اور گمان پر اس کی عمارت قائم ہے،

قُلْ هَلْ عِنْدَکُمْ مِّنْ عِلْمٍ	کہدو: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ	(اگر ہے) تو اسے ہمارے سامنے لاؤ
اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا	تم محض خیال کے پیچھے چلتے اور اٹکل کے
تَخْرُصُوْنَ ۔ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ	تیر چلاتے ہو، کہدو خدا ہی کی حجت
الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىکُمْ	غالب ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو
اَجْمَعِیْنَ [۳]	ہدایت دیدیتا۔

[۱] حٰم السجدہ: ۴۲ [۲] الشوریٰ: ۵۲ [۳] الانعام: ۱۴۶

مشاہدہ وتجربہ کی اہمیت

اس علم کا ذریعہ مشاہدہ اور تجربہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کے اندر ودیعت کیا ہے، ایک چیونٹی اپنی قوت شامہ سے پتا لگا لیتی ہے کہ اس کی غذا (مٹھاس) کہاں ہے، ایک شاہین اپنی قوت باصرہ سے کئی میل کی دوری سے دیکھ لیتا ہے کہ اس کا شکار کہاں ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لیے کہ اس کی قوت مشاہدہ سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے محسوسات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر دیکھ لیتا ہے جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی، اپنے تجربات کی روشنی میں آیندہ سامنے آنے والی بات کو جان لیتا ہے اور معلوم سے نا معلوم کو اور موجود کو دیکھ کر غیر موجود تک رسائی حاصل کرتا ہے اور وہ اپنی معلومات کو مرتب کر کے ایک واضح نتیجہ نکالتا ہے، یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے جس طرح اس کی فطرت کا تقاضا جلب منفعت اور دفع مضرت ہے اپنی ضروریات کا حاصل کرنا اور خطرات سے بچنے کی تدبیر کرنا، اس کے لیے کسی رسول یا آسمانی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ خود اس کی فطرت سکھاتی ہے اور اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مشاہدات کو کام میں لا کر صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، قرآن نے ایسے لوگوں کا ذکر تحسین کے انداز میں کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ	جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے
قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ	ہونے کی حالت میں اور بیٹھے رہنے
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	کی حالت میں اور (سوتے میں) کروٹ
وَالْاَرْضِ [۱]	لینے کی ہیئت میں اور آسمانوں اور
	زمین (کی خلقت) میں غور کرتے ہیں۔

[۱] آل عمران: ۱۹۱۔

یہ مشاہدہ اس کی فطرت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ یہ نتیجہ نکالے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا	اے پروردگار تونے اس (مخلوق)
(آل عمران: ۱۹۱)	کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا ہے۔

اس کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محکم نظام تخلیق کا مطالعہ کرے اور یہ دیکھے کہ آیا وہ ذات جو کسی چیز کو عدم سے وجود میں لاسکتی ہے کیا اس میں یہ قدرت نہیں کہ دوبارہ اپنی پیدا کردہ مخلوق کو زندگی بخش دے؟

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ	کیا انھوں نے نہیں دیکھا خدا کس طرح
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ	خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر
عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ قُلْ سِيرُوا	(کس طرح) اس کو بار بار پیدا کرتا
فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ	رہتا ہے۔ یہ خدا کو آسان ہے، کہہ دو
بَدَأَ الْخَلْقَ ۚ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ	کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے
النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ [1]	کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا
	ہے پھر خدا ہی پچھلی پیدائش کرے گا
	بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

"سیر فی الارض" اور "مطالعہ تخلیق" سے اس بات کا یقین حاصل کرنا کہ اللہ تعالیٰ "نشاۃ آخرۃ" پر قادر ہے، انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور اسی طرح نظر آنے والی اشیاء (مرئیات) کو ذریعہ بنا کر ان حقائق کی دریافت کرنا جو نظر نہیں آرہی ہیں، جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی ہیں "علم" ہے جس کو اصطلاحات جانے بغیر آدمی ہمیشہ حاصل کرتا رہتا ہے۔

[1] العنکبوت: ۱۹، ۲۰۔

کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ خدا پر ایمان تم کس دلیل سے لائے ہو، تو اس نے کہا راستہ میں یا بیابان میں کسی اونٹ کی مینگنی (فضلہ) دکھائی دیتا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ اونٹ یہاں سے گذرا ہے، تو کیا یہ آسمان، زمین، چاند، سورج، طلوع و غروب کا نظام، ہواؤں کا چلنا، پانی کا برسنا، ہمیں بتاتا نہیں کہ یہ سب کسی کے حکم و ارادہ سے ہو رہا ہے۔ ایک شاعر لبید بن ربیعہ کا یہ شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا تھا۔

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ — وَكُلُّ نَعِيمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلُ

سن لو کہ اللہ کے علاوہ ہر شئے ناپائیدار ہے اور سامان آسائش سب کا سب فنا ہونے والا ہے

اس جاہلی شاعر کو کس نے بتایا کہ ہر شئے فانی ہے، اس کو آسمانی وحی کا علم نہ تھا، اس کا مشاہدہ تھا کہ آئے دن لوگ مرتے رہتے ہیں، اس نے اپنے بڑے بوڑھوں سے ایسے قصے سنے تھے کہ بڑے بڑے حکمراں اور دولت مند فنا ہوگئے، بڑے بڑے طاقتور موت کے آگے بے بس ثابت ہوئے، لہٰذا تجربہ و مشاہدہ نے اس کو اس دنیا کے ناپائیدار ہونے کا یقین دلایا، خلاصہ یہ کہ فطرت بشری خود معلم ہے، انسان کو ہنسنا رونا کون سکھاتا ہے؟ راستہ چلنا، پانی پینا، نوالہ منہ میں ڈالنا کون بتاتا ہے، کھیتی کرنا، دن ہی کو رات کی روشنی کا بندوبست کرلینا، بیماری میں علاج اور پرہیز کرنا ان سب کو بتانے کے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا جاتا، کیونکہ ہر حیوان کو اس کی زیست کو باقی رکھنے اور آیندہ نسل کو جاری رکھنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا ہے۔

اس طبعی و فطری علم کو بڑھا کر اور ایک سامنے نظر آنے والی چیز سے دوسری سامنے نظر نہ آنے والی چیز کا پتہ لگالینا اور پھر اس کو بنیاد بنا کر زینہ بزینہ آگے بڑھنا

اور ایک نسل کی جمع کردہ معلومات کو مقدمہ بنا کر آنے والی نسل اپنے تجربات و مشاہدات
سے مجموعہ معلومات میں اضافہ کرتی جاتی ہے، یہ انسانی فطرت اور اس کے اشرف المخلوقات
ہونے کی دلیل ہے، پھر چونکہ زندگی کے ہزاروں گوشے ہیں اور ہر گوشہ ایک لامتناہی علم
و دریافت کا سلسلہ رکھتا ہے اس لیے ان کی تبویب CLASIFICATION ضروری
تھی، جن لوگوں نے اس طرح ایک خاص پہلو کے کام کیے اور ان کو آگے بڑھایا ان کو حکیم
و دانا کے لقب سے نوازا گیا۔

عربوں کو جب اللہ تعالیٰ نے دولت اسلام سے نوازا تو ان کو علم کا حقیقی ماخذ
مل گیا اور کائنات اور ماورائے حیات کے تمام حقائق ان کو قرآن نے بتا دیے، ان کی
سادہ فطرت نے اس کو قبول کیا، ان کی سادہ فطرت کی مثال ایک چشمہ رواں کے
صاف شفاف پانی کی ہے، جس میں کوئی باہری گندگی، غلاظت، مردار اور ناپاک
آلائش نہیں گری تھی۔ اس لیے آسمان سے احکام آئے، مغز کی بات، پختہ، کارآمد اور
ٹھوس بات ان کو رسول برحق نے بتایا وہ انھوں نے دل و جان سے قبول کر لیا، لیکن
زمین کے وہ حصے جو وحی کی براہ راست روشنی سے محروم تھے ان کے علم میں حصہ صرف
ایک ذریعہ سے ملتا تھا جو بشریت کا خاصہ اور طبعی ہے، اس میں بھی دنیا بھر کی آلائش،
تجربات کی ناہمواری، مشاہدات کا نقص، استقرار کی کمی، ان سب نے مل ملا کر ایک
طرف ان کو بے جا تکبر اور پندار میں مبتلا کر دیا تھا دوسری طرف حقائق سے دور رکھا تھا
وہ تجربے کرتے اور ٹھوکریں کھاتے، اپنی معلومات کو ترتیب دے کر نامعلوم (مجہولات)
کو اپنے احاطہ علم میں داخل کرتے اور ان کی فکری لغزش بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی
جیسے ریاضیات میں ایک صفر کی غلطی پورے حسابی عمل کو ضایع کر دیتی ہے اسی طرح ہر

سائنس (علم) کا حال ہے، چنانچہ یونان کو دنیا میں اس بات میں فوقیت حاصل تھی کہ
انھوں نے سب سے پہلے لسانیاتی علوم کے فارمولے بنائے، علم الافلاک اور طبقات
الارض میں اپنی معلومات کو ترقی دی۔

مسلمانوں میں علم منطق کا رواج

مسلمانوں کو پہلی اور دوسری صدی ہجری تک ان علوم کا پتہ نہیں تھا اور
وہ اپنی سادہ فطرت کے مطابق قرآن کریم سے وابستہ تھے،
قرآن کریم کے بعد اپنے رسول برحق کے اعمال و اقوال (جن کے مجموعہ کو سنت کہا جاتا ہے)
پر عمل پیرا تھے، تیسری صدی ہجری میں جب اسلام کے حلقہ بگوش جزیرہ عرب ہی
تک محدود نہ تھے، دوسری قومیں فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگیں، تو یونان
کے فلسفہ داں، مشرک اور وثنیت پرست عقلی راہ سے اسلام پر حملہ آور ہوئے اور
اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اعتراض کرنے لگے، نئے نئے مسلمان جن میں عقلی و
ایمانی پختگی نہیں آئی تھی، ان اعتراضات کے سامنے لاچار نظر آنے لگے، اس لیے ضرورت
محسوس ہوئی کہ ان مدعیان عقل و دانش کے فلسفہ کو سمجھا جائے، جن کے ذریعہ وہ اسلامی
تعلیمات و عقائد پر حملے کرتے ہیں، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے تیسرے دہے میں
مامون الرشید کی خواہش پر یعقوب بن اسحاق الکندی م ۲۴۶ھ نے یونانی منطق
کا سراغ لگایا اور بحث و مناظرہ کے ابتدائی اصول کا یونانی زبان سے عربی زبان میں
ترجمہ کیا، محمد رضا کحالہ نے "المعقول والمنقول" میں لکھا ہے کہ پہلا رسالہ جو یونانی سے
عربی میں منتقل ہوا وہ ایساغوجی ISSAGOGE تھا جس میں منطق کے اصول
مدون تھے اور اصول موضوعہ اور اصول مصادرہ بھی مرتب کیے گئے تھے، کہا جاتا ہے
کہ اس فن کے ابتدائی نقوش پر جس نے رنگ بھرا وہ ابو نصر فارابی (م ۳۳۹ھ) تھے

اوران کے سو برس بعد ابو علی سینا (م ۴۲۸ھ) نے جو اصلاً بخارا کے رہنے والے تھے
اس فن کو ازسرنو مرتب کیا اور ارسطو کے تجویز کردہ طریقہ استنتاج کی ایک شکل سے تین
مزید شکلیں مرتب کیں اور اس کے ماہیت، ہیولیٰ، تسلسل، دوران، ارتفاع نقیضین، کا
اضافہ کیا، مسلمانوں میں اس فن سے کام لینے والے اور علم کلام کی بنیاد ڈالنے والے امام
غزالی (م ۵۰۵ھ) ہیں جنھوں نے اس فن سے پورا کام لیا اور اس فن کی تحقیر و مذمت بھی کی،
اور دکھایا کہ فلسفۂ یونانی اسلام کا ضد ہے، اپنی کتاب "تہافتہ الفلاسفۃ" میں فلسفۂ یونان کا
تجزیہ کرکے دکھایا کہ اس ذریعہ علم کا یہ ضد ہے جو وحی رسالت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے،

فن منطق اسلامی علوم کا جز لاینفک کب بنا

عالم عرب کے دوسرے سرے (مغرب) میں مسلمانوں نے اپنے
عروج کے زمانہ میں اس فن کو ترقی دی اور وہیں ابن رشد
(م ۵۹۵ھ) پیدا ہوئے جنھوں نے منطق و فلسفۂ یونان کو اسلامی تعلیمات کا خادم اور
علوم دینیہ کے لئے آلہ کی حیثیت سے پیش کیا، امام غزالی کا رد "تہافتہ التہافت" کے نام
سے لکھا، اس وقت سے یہ فن مسلمانوں کا فن بن گیا، یعنی چھٹی صدی ہجری کے آخر سے اس دور
تک علوم اسلام کا یہ ایک جز بن گیا اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے
کہ ملا کاتب چلپی مرحوم نے "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" میں امام غزالی
کا یہ قول نقل کیا ہے۔

من لم یعرف المنطق	جو منطق نہیں جانتا اس کا علوم کے
فلا ثقة له فی العلوم	معاملہ میں کوئی اعتبار نہیں ہے، کچھ
اصلاحتی قال البعض	لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے
انه فرض کفایة وروی	اور بعض لوگوں سے یہ قول مروی
عن البعض انه فرض عین	ہے کہ اس کا حصول فرض عین ہے۔

واضح رہے کہ امام غزالیؒ کی یہ اپنی رائے نہیں ہے بلکہ وہ چند مجہول افراد کا ذکر
کررہے ہیں کہ ان کا ایسا خیال ہے لیکن اس سے قطع نظر اتنی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس
فن کو یک گونہ "تقدس" کا درجہ حاصل ہو گیا تھا، میرے خیال میں اس کا سبب یہ تھا
کہ اللہ کی ذات و صفات پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کا جواب اس انداز میں
جو یونانی عقل پرستوں کے لیے قابل قبول ہو منطق ہی کے ذریعہ ممکن تھا۔ امام غزالی نے
اس فن کی تردید اور اس کو مخالف دین ضرور بتایا مگر جیسا کہ اوپر کہا گیا اس سے کام بھی
لیا اور معاندین کو جواب انہی کی منطق سے دیا، جیسا کہ عربی مثل ہے الحدید بالحدید
یقطع اس لیے باوجود مخالفت کے ان کے دلائل کی قوت نے لوگوں کو منطق سے بدظن
نہیں کیا، خاص طور پر جب ابن رشد نے امام غزالی کے دلائل کی تردید کرکے دکھایا کہ منطق
و فلسفۂ یونانی ایک سلاح ہے جس سے تعمیر و تخریب دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے اور
اگر اسلام کی مخالفت میں استعمال ہو سکتا ہے تو اس کی تائید کا فائدہ بھی اس سے
حاصل کیا جاسکتا ہے، اس وقت سے منطق گویا مسلمانوں کا فن بن گیا۔

علامہ ابن تیمیہؒ اور رد منطق

مگر واضح رہے کہ یہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ ہے جو عالم اسلام
کے بڑے انحطاط کا دور تھا، اللہ کی مشیت نے آٹھویں صدی ہجری
میں ایک قدآور شخصیت امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کی پیدا کردی اور عین اس وقت
جب کہ منطق کا غلغلہ مچا ہوا تھا اور جس وقت کوئی کتاب خواہ کسی فن میں لکھی جاتی منطق سے
بے نیاز نہیں ہو سکتی تھی، عین اس زمانہ میں ابن تیمیہؒ نے اس فن کی مخالفت میں مستقل
رسالہ "الرد علی المنطقیین" لکھا، جس میں مدلل طریقہ پر اس پورے مجموعہ استدلالات کا

رد کیا اور دکھایا کہ اصول شریعت میں ہر اعتراض کا جواب موجود ہے، ہمیں دلائل کے لیے یونان کا رہینِ منت ہونا غلط ہے، امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ دونوں نے منطق کا رد کیا ہے مگر امام غزالیؒ نے خود اس فن سے کام لیا جبکہ امام ابن تیمیہ نے اس کو یکسر ناقابل التفات سمجھ کر چھوا بھی نہیں۔

بہرحال زمانہ گزرتا رہا مگر اس فن کو مسلمانوں میں چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں جو اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس نے بعد کی صدیوں میں یک گونہ تقدس کا درجہ حاصل کر لیا، شروع میں تو اس کو بعینہ اسی طرح قبول کیا گیا تھا جس طرح موجودہ دور میں کوئی انگریزی یا کسی یورپین زبان کو پڑھے تاکہ مستشرقین و معاندین اسلام کے اعتراضات کا جواب انہی کی زبان و لہجہ میں دے مگر امام غزالیؒ کے عہد میں اس کا جو عروج ہوا اس کی وجہ سے اس زمانہ میں تفسیر، بلاغت، اصولِ فقہ وغیرہ کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس پر اس فن کی چھاپ نہ ہو، یہی نہیں بلکہ بعض فنون سے اس کا ربط نہیں تھا جیسے بلاغت، اس کو بھی از سرتا پا اسی رنگ میں رنگ دیا گیا، اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ عبدالقاہر الجرجانی کے درجات بلند کرے کہ انھوں نے اس طلسم سے بلاغت کو نجات دلائی ورنہ "المفتاح" اور "تلخیص المفتاح" "مختصر المعانی" اور مطول نے تو اس موضوع کو ایک چیستاں بنا دیا تھا، ڈاکٹر ابو موسیٰ استاد ادب عربی جامعہ ازہر (کلیہ اللغۃ) نے خصائص التراکیب میں "تلخیص المفتاح" کی تعریف کی ہے کہ اس میں تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے مگر وہ بہت احتیاط اور حسن ادب کے ساتھ لکھتے ہیں:

ولولا المؤلف اولع بتطبيق	اگر (محمد بن عبدالرحمٰن قزوینی صاحب
اساليب العرب على علوم	تلخیص) عربی اسالیب کو یونانی علوم

اليونان واصطلاحاتهم	اور اس کی اصطلاحوں پر ڈھالنے
مع ما بينهما من بعد الدار و	کے شائق نہ ہوتے اور سمجھتے کہ ان
شط المزار واختلاف	علوم یونان اور اسالیب عرب میں
البيئات و تباين المعتقدات	مکانی و زمانی فرق کیا ہے، دونوں
لكان خير كتاب أخرج	کے ماحول اور معتقدات میں آسمان
للناس في هذه الفنون	زمین کا فرق ہے، (اگر وہ اس فرق
	کو ملحوظ رکھ کر منطق سے اپنی کتاب کو
	آزاد رکھتے) تو ان کی کتاب اس فن
	کی شاندار کتاب ہوتی جواب تک
	تالیف کی گئی ہے،

یہی حال اصول فقہ کا ہوا، تفسیروں میں سے بعض تفسیریں بالکل اسی رنگ میں لکھی گئیں، جیسے تفسیر کبیر امام رازی، جب ساتویں صدی کے دور انحطاط اور دور جمود کا علمی ورثہ مسلمان اپنے ساتھ برصغیر (ہندو پاکستان) لائے تو علوم میں ان کا سرمایہ منطق تھا۔

ایک بات قابل غور یہ بھی ہے کہ یونان جس سے عربوں نے تیسری صدی ہجری میں منطق کی ابتدائی چیزیں حاصل کی تھیں وہاں اس فن کے مبادی اور استخراجی منطق کا دور ختم ہوا اور یورپ نے استقرائی منطق پر محنت صرف کی اور اس کو مقدمہ بنا کر سائنس اور تکنولوجی کی دنیا میں انکشافات شروع کیے، ادھر مسلمان استخراجی منطق کے ذریعہ اسی پرانے مورچے پر جمے رہے، جس کو غنیم فوج چھوڑ کر آگے بڑھ چکی تھی۔

دوسری بات اس سلسلہ میں قابل لحاظ یہ ہے کہ منطق کے اصول کو دوسرے فنون پر

تطبیق دے کر آسان بنانے یا اس فن کو آگے بڑھانے کی جو کوشش ہوئی وہ صرف قصر وحصر
اور ایک چیز کی زیادہ سے زیادہ تقسیم اور احتمالات کی قوت کو بڑھانے تک محدود رہی، چنانچہ
بکثرت شقیں نکالنے میں پوری ذہانت صرف ہوئی، آپ کسی فن کی کتابیں پڑھیں تو محسوس
ہوگا کہ ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں، تاریخ کی ایک کتاب لیجیے اس میں اگر
آپ نے پہلی جلد میں ظہور اسلام سے عصر اسلامی تک کے حالات پڑھے تو دوسری جلد میں عصر
اموی سے عصر عباسی تک کے حالات ہوں گے، اگر ایک ہی مؤلف کی کتابیں نہیں ہیں جب بھی
ایک ابتدائی درجہ کی کتاب سے ثانوی درجہ کی کتاب مختلف ہوگی، فقہ میں طہارت وعبادات
کے بعد معاملات کا بیان آپ پڑھیں گے، مگر منطق کی کتاب دیکھ جائیے صغریٰ، اوسط،
کبریٰ، میزان المنطق سے لے کر سلم العلوم اور اس کی شرحوں قاضی مبارک، ملا حمد اللہ کو
پڑھ جائیے مسائل و اصول میں کوئی ترقی نہ ہوگی، ہاں طرز بیان اور احتمالات کی کثرت،
نئی شقوں کے پیدا ہونے کے امکانات سے بات آگے نہیں بڑھے گی،

ہندوستان میں فن منطق کی مقبولیت

ہندوستان (غیر منقسم جس کو برصغیر کہا جاتا ہے) میں اس فن کی بڑی
پذیرائی ہوئی اور سو ڈیڑھ سو برس تک اعلیٰ ذہانتوں، طبیعت کی
جولانیوں اور نکتہ آفرینی کا یہ فن مرکز رہا، درس نظامی میں ملا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے
اس فن کی ایک کتاب رکھی تھی ان کے صاحبزادے ملا بحر العلوم نے اپنی شرح کا اضافہ
کیا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ درس نظامی میں منطق کی ستولہ کتابیں داخل ہو گئیں،

۱۳۱۱ھ میں جب انجمن ندوۃ العلماء کی کانپور میں بنیاد پڑی تو اس کے تمام بانی
حضرات بھی جامع معقول و منقول علماء میں سے تھے، ان میں کوئی ایسا عالم نہ تھا جو منطق سے
لاعلمی کی بنا پر اس سے بیر رکھتا ہو، جب علامہ شبلی نعمانی اس انجمن میں شریک ہوئے اور

سرگرمی سے اس کی دعوت کو پھیلانے میں مصروف ہوئے تو وہ بھی معقولات کی تمام
متداول کتابوں پر حاوی تھے، اس وقت کا ذوق ہی یہی تھا کہ کوئی اس سے بے نیاز
نہیں ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ سرسید کی تفسیر اور ان کے مضامین میں اس کی اصطلاحات
اور بے شمار تلمیحات موجود ہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے تو اس فن میں اردو میں ایک رسالہ ہی
لکھا ہے جس کا نام "مبادی الحکمۃ" ہے۔

ان علماء نے جو ندوہ کے بانی تھے معقولات میں دسترس رکھنے کی وجہ سے یہ سمجھا کہ
کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو سمجھنے اور دین کی دعوت عصر حاضر میں دینے کے لیے
منطق کا دور ختم ہو چکا ہے، اس لیے منطق کو نصاب سے ختم تو نہیں کیا مگر کم کر دیا اور
دوسرے علوم پر توجہ صرف کی، بہرحال یہ جملہ معترضہ ہے اور یہ مستقل موضوع گفتگو ہے۔

ان باتوں کے باوجود منطق ہمارے اسلاف کی کتابوں میں اس درجہ رچ گئی ہے
کہ ہم اصول فقہ اور بلاغت میں تو اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں مگر تفسیر کے ایک رنگ کو
سمجھنے کے لیے علم کلام کے سابقہ اصول جاننے کے لیے اور قدماء کے طرز تفہیم سے آگاہ
ہونے کے لیے اس کی ضرورت باقی رہتی ہے

حرم نبوی شریف کے شیخ تفسیر اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاد علامہ
شیخ محمد الامین الشنقیطیؒ نے جامعہ اسلامیہ کے طلبہ کے لیے ایک رسالہ آداب البحث
والمناظرۃ کے نام سے مرتب فرمایا تھا جس کی غرض بھی وہی تھی جو اردو میں راقم کی کتاب
کی غرض ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں اچھی بات لکھی ہے۔

لاشك أن المنطق لو لم	بلا شبہ اگر منطق کا عربی میں ترجمہ
يترجم إلى العربية ولم	نہ ہوا ہوتا اور مسلمانوں نے اس کو

یتعلمه المسلمون لکان دینهم	نہ سیکھا ہوتا تو وہ اپنے دین اور عقیدہ
وعقیدتهم فی غنی عنه	کے لیے اس کے قطعاً محتاج نہ ہوتے
کما استغنی عنه سلفهم الصالح	بلکہ اس سے اسی طرح بے نیاز رہتے
ولکن لما ترجم وتعلمه	جس طرح ان کے سلف صالح بے نیاز
صارت اقیسته هی الطریق	رہے[1] لیکن جب ان کے ترجمے ہوگئے
الوحیدة لنفی بعض صفات	اور منطقی قیاس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ
الله الثابتة فی الوحیین کان	کی ان صفات کی نفی کی جانے لگی، جو کتاب اللہ
ینبغی لعلماء المسلمین أن	اور سنت نبویؐ سے ثابت ہے تو علمائے
یتعلموه وینظروا فیه	اسلام کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ
لیردوا حجج المبطلین بعکس	ان کے دلائل کا جواب اسی لب ولہجہ
ما استدلوا به علی نفیهم	اور انہی منطقی قیاسات کے ذریعہ
لبعض الصفات لأن انهم	دیں جس سے کام لے کر انھوں نے
بنفس أدلتهم أدعی......	صفات الٰہی کی نفی کی تھی، یہ ان کو خاموش
لانقطاعهم الزامهم الحق	کرنے کے لیے اور حق ثابت کرنے کے
	لیے زیادہ کارآمد ہے۔

لیکن جب وہ زمانہ گزر گیا اور غنیم اس مورچہ سے ہٹ کر دوسرے مورچوں سے اسلام پر حملہ آور ہونے لگے اس وقت بھی ہم اسی قدیم مورچے پر اسی شدت اور جوش کے

[1] جیسے صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، امام بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور ائمہ مذاہب حضرات امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور ان کے ہزارہا ہزار شاگرد،

ساتھ جمے رہیں اور اپنی عقلی و ذہنی توانائی اس پر صرف کرتے رہیں ہماری علمی تاریخ کا ایک سانحہ ہے۔

اس موقع پر امام ابن تیمیہ کا قول بھی دہرانا مناسب ہوگا، جو انھوں نے "الرد علی المنطقیین" کے شروع میں لکھا ہے۔

أما بعد فانی کنت وانما	میں جانتا تھا کہ یونانی منطق کی ذہین
أعلم أن المنطق الیونانی	آدمی کو ضرورت نہیں ہے اور غبی
لا یحتاج إلیه الذکی ولا	اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔
ینتفع به البلید۔	

اس کے بعد انھوں نے لکھا کہ شروع میں میرا خیال تھا کہ اس کے قضایا مبنی بر عقل ہیں مگر بعد میں غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ سب باطل ہیں اور یونان کے ارسطو اور مشرکین سے ہمیں قرآن نے اور اس کے رسول کی احادیث نے بے نیاز کر دیا ہے۔

عام طور پر اس فن کی حمایت کرنے والے اور اس کے رواج کو زندہ رکھنے والے منطق کے دو فائدے بتاتے ہیں، ایک یہ کہ اس سے ذہن میں تیزی آتی ہے جس کو یہ حضرات تشحیذ ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے چھری یا تلوار کی دھار سان پر چڑھا کر تیز کی جاتی ہے اسی طرح منطق کی سان پر چڑھ کر ذہن تیز ہو جاتا ہے گویا کہ ایک طرح کا SHRPNESS آتا ہے۔

جہاں تک پہلے فائدہ کا تعلق ہے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے البتہ علمائے منطق کی پیروی کرتے ہوئے ہم اس کی دو قسمیں کر سکتے ہیں، سلف کی وہ کتابیں جن سے استغنا ممکن ہے اور دوسری قسم ان کتابوں کی ہے جن سے استغنا ممکن نہیں ہے پہلی قسم میں

بلاغت کی کتابیں ہیں جن سے بدرجہا بہتر اور مفید، قرآن کریم کی زبان سے
قریب کرنے اور اس کی عظمت کو ذہن نشین کرانے میں معاون کتابیں نکل چکی
ہیں اور سلف میں بھی شیخ عبدالقاہر جرجانی کی دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ
موجود ہیں، اصول فقہ کا بھی بہتر بدل تیار ہو چکا ہے ہاں تمثیل کی حد تک جس کو ہم اصول
فقہ میں قیاس کہتے ہیں یعنی تقدیر الفرع بالاصول فی الحکمۃ والعلۃ"
اس باب میں منطق سے جو فائدہ اٹھایا گیا ہے وہ قابل اعتراف ہے، دوسری قسم
میں بحث ومناظرہ کی کتابیں ہیں اور قدیم علم الکلام ہے، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ
دہلوی کی بعض کتابوں (سب نہیں) سمجھنے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے اسلاف کا
علوم دینیہ کو بیان کرنے میں کیا اسلوب رہا ہے، اس فن کی اصطلاحات کا جاننا
ضروری ہے۔

اب رہا دوسرا فائدہ تشحیذ ذہنی کا اس کا اسی حد تک قائل ہوا جا سکتا ہے کہ
اس فن کی کتابیں پڑھنے سمجھنے اور احتمالات پیدا کرنے اور ان کے جواب دینے میں
یہ مفید ہے، دوسرے علوم وفنون یا بنیادی معاملات میں اس کی تیزی کام نہیں
آسکی، اگر حقیقت پسندی سے کام لیں تو اس کو ایک مثال سے واضح کر سکتے ہیں،
لوگ کہا کرتے ہیں کہ شطرنج سے عقل بڑھتی ہے یہ بات صحیح ہے مگر شطرنج ہی کی دنیا
... میں عقل تیز ہوتی ہے اس بساط سے باہر وہ کارآمد نہیں ہوتی۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے الرد علی المنطقیین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ
کا یہ قول نقل کیا ہے:

إذا لهوتم فالهوا بالرمي — اگر تفریح چاہتے ہو تو تیر اندازی

وإذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض — کی مشق سے تفریح کرو اگر کوئی موضوع گفتگو مطلوب ہے تو فرائض کو اپنا موضوع بناؤ۔

اس پر امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

کیونکہ حساب وفرائض عقلی علم ہے اور اس کی بنا ایک شرعی حکم پر ہے اس میں
عقل کی ریاضت بھی ہوتی ہے اور شریعت کی محافظت بھی اور یہ علم برائے
علم نہیں ہے۔

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں:

ذہن کو تیز کرنے کے لیے ریاضیات سے بہتر کوئی علم نہیں ہے، الجبرا
اور اقلیدس کے فارمولے اور معلوم عدد سے نامعلوم عدد کا نکالنا
ذہانت کا طالب ہے اور ذہن کی ایسی ورزش ہوتی ہے جو مفید ہے، اسی لیے
حساب، الجبرا، اقلیدس کے علم کو 'ریاضیات' کہتے ہیں۔

بہر حال ایک محدود فائدہ علم منطق کا قابل تسلیم ہے کہ اصول فقہ اور
علم کلام میں سلف کی بعض کتابیں اور چند تفسیریں جو اس رنگ میں لکھی گئی ہیں
ان کی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے اور اپنے قدیم علمی ورثہ سے تعلق رکھنے کے
لیے اس فن کی اصطلاحات جاننا چاہیے مگر اصطلاحات کی صرف تعریفیں بغیر
موضوع کو سمجھے ہوئے مفید نہیں ہوتی ہیں

کلمہ "زندنیچی" کے بارے میں ایک مختصر گذارش

از

پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ

زندنیچی فارسی زبان کا ایک لفظ ہے جو ایک قسم کے سوتی کپڑے کا نام تھا جو بخارا کے قریب کے ایک گاؤں زندنہ میں بُنا جاتا تھا۔ اس لفظ کے تلفظ وغیرہ کے بارے میں کچھ اختلاف ہے، چنانچہ اس مختصر سے مقالے میں بعض ضروری تفصیل پیش کی جارہی ہیں:

زندنیچی کی دو اور متداول صورتیں زندنیجی اور زندیچی ہیں، ان تینوں میں سے پہلی دو صورتیں تو ج اور چ کے فرق سے پیدا ہوئی ہیں اور یہ امتیاز دونوں حرف کے درمیان نقطوں کی بنیاد پر ہے جو قبلاً لکھے نہیں جاتے تھے، اس بنا پر ج اور چ کا فرق زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، البتہ تیسری صورت میں 'ن' کے بجائے 'پ' ہے اور یہ یقیناً تحریف و تصحیف ہے۔

فرہنگ قواس[1] قدیم ترین لغت ہے جس میں یہ لفظ زندنیچی کی شکل میں (ص ۱۵۲)

---

[1] علاء الدین خلجی ۶۹۵-۷۱۶ھ کے عہد میں ہندوستان میں مرتب ہوئی، اس کا ایک ناقص نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے، اس کی بنیاد پر راقم کی توجہ سے بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران کی طرف سے ۱۹۷۴ء میں طبع ہوگئی۔ اس سے صرف ایک ہی قدیم لغت فرہنگ اسدی ہے جس میں یہ لفظ شامل نہیں، قواس کے قریبی عہد میں یعنی ۷۲۸ھ میں صحاح الفرس تالیف ہوئی اس میں بھی یہ لفظ نہیں آیا، دستور الافاضل ۷۴۳ھ میں تالیف ہوئی ہے وہ بھی اس لفظ سے خالی ہے۔

ملتا ہے، زفان گویا (خطی)، بحر الفضایل (خطی)، فرہنگ جہانگیری ج ۲ ص ۱۸۳۰ میں قواس ہی کی روایت موجود ہے یعنی زندنیچی، قواس اور جہانگیری میں خاقانی کی یہ بیت بطور شاہد درج ہے:

چون باد زندنیچی کہسار بر کشد
بر خاک و خارہ[1] سندس[2] و دیبا[3] بر افگند

قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہی بیت رشیدی میں موجود ہے لیکن اس میں یہ لفظ زندپیچی کے شاہد کے طور پر نقل ہے لیکن دیوان کے نسخے میں زندنیچی اور زندپیچی کے بجائے زندنیچی ہے۔ رشیدی زندپیچی بلفظ قرار دینے میں صرف تنہا نہیں بلکہ مدار الافاضل اور برہان قاطع ۱۰۳۸ میں بھی زندپیچی ہی ہے جو یقیناً زندنیچی = زندنیچی کی تصحیف ہے۔

تاریخ بخارا تالیف نرشخی[4] میں کم از کم چار بار زندنیچی مع اس کی وجہ تسمیہ کے آیا ہے اس کے بیان کی اہمیت کے اعتبار سے اس کا قول ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

---

[1] خارہ۔ خارا سخت پتھر [2] ریشمی زربفت، حریر [3] یہ بھی ریشمی کپڑا ہے [4] ابوبکر محمد بن جعفر نرشخی کی عربی زبان میں یہ تاریخ ابو نصر احمد قباوی نے ۵۲۲ میں فارسی کا جامہ پہنایا تھا۔ عربی اصل اور فارسی ترجمہ دونوں ناپید ہیں، البتہ قباوی کے ترجمہ کی ایک فارسی تلخیص جس کو محمد بن زفر نے ۵۷۴ میں تیار کیا موجود ہے، یہ کتاب ۱۸۹۲ میں شارل شیفر کے اعتنا سے فرانس میں طبع ہو چکی، ۱۹۰۴ میں بخارا میں چھپی اور ۱۳۱۷ شمسی میں تہران میں مدرس رضوی نے ترتیب دے کر چھاپا، ۱۳۶۳ شمسی میں یہ کتاب تہران میں دوبارہ چھپی، ۱۸۹۷ میں اس کا ترجمہ فرانسیسی میں، ۱۹۵۴ میں انگریزی میں، اور ۱۹۶۵ میں عربی میں ہوا۔ علامہ محمد قزوینی نرشخی صحیح قرار دیتے ہیں، رک: یادداشتہای قزوینی ج ۷ ص ۱۹۸۔

زندنہ[1] کندزی[2] بزرگ دارد وبازار[3] بسیار
ومسجد جامع، ہر آدینہ آنجا نماز گزارند
وبازار کنند وآنچہ از وی خیزد آنرا
زندنیجی گویند کہ کرباس[4] باشد یعنی از
دیہہ زندنہ، ہم نیکو باشد وہم بسیار
بود وکرباس بہ بسیار دیہہای بخارا
بافند وآنرا ہم زندنیجی گویند از بہر
آنکہ اول بدین دیہہ پدید آمدہ است
وازان کرباس بہ ہمہ ولایتہا برند
چون عراق وفارس وکرمان وہندوستان
وغیران، ہمہ بزرگان وپادشاہان ازان
جامہ سازند وبہ قیمت دیبا خرند...
وردانہ[5] دیہی بزرگ است ...

زندنہ میں ایک بڑا پرانا قلعہ ہے اور
بہت سے بازار اور جامع مسجد جس میں
ہر جمعہ کو نماز ہوتی ہے اور بازار لگتا ہے
وہاں جو چیز (پیدا) ہوتی ہے اسکو زندنیجی
کہتے ہیں جو سوتی کپڑا ہے (یعنی زندنہ گاؤں
سے) یہ کپڑا اچھا بھی ہوتا ہے اور کثرت
سے بھی ہوتا ہے اور سوتی کپڑا بخارا کے
بہت سے گاؤں میں بنتے ہیں اور اس کو
بھی زندنیجی کہتے ہیں اس وجہ سے کہ سب سے
پہلے اسی گاؤں میں (زندنہ میں) وہ بنا گیا
تھا اور اس سوتی کپڑے کو وہاں سے تمام
ممالک میں جیسے عراق، فارس، کرمان
اور ہندوستان وغیرہ میں بھیجتے ہیں

[1] بخارا کے مضافات کا ایک قریہ ہے [2] کہن دز سے مستفاد ہے، معرب تنکل قندز ہے [3] ایران، ماوراء النہر میں پرانے بازار مسقف ہوتے، جس میں ساری دکانیں واقع ہوتی تھیں جو خرید و فروخت کے بڑے مرکز ہوتے [4] کرباس یا کرپاس سستے سوتی کپڑے کے معنی میں آتا ہے (فرہنگ معین) لیکن زندنیجی اچھے قسم کا سوتی کپڑا تھا جیسا کہ تاریخ بخارا سے معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ دنیا کی قیمت میں اسکا خریدنا اور معزز حضرات اور سلاطین وغیرہ کے لباس میں کیونکر استعمال ہوتا۔ [5] واضح رہے کہ زندنیجی اب صرف زندنہ کی تخصیص نہیں رہ گئی تھی، دوسرے اور گاؤں میں یہ کپڑا بنا جاتا تھا۔

آنچہ از آن جا خیزد وہم زندنیجی بود نیکو
(ص ۲۱-۲۲)

وازو لایتہا بازرگانان بیایند چنانکہ
مردم زندنیجی می برند از آن جاہا بردندی
تا بہ شام ومصر ودر شہرہای روم وبہ ہیچ
شہر خراسان نبافتندے.... وہیچ پادشاہ
وامیر ورئیس وصاحب منصب نبودے
کہ وی را ازین جامہ نبودے ورنگ وی
سرخ وسفید وسبز بودے وامروز زندنیجی
ازان معروف تر است بہ ہمہ ولایتہا۔
(ص ۲۸-۲۹)

سارے معزز لوگ اور سلاطین اسی سے
لباس سلواتے ہیں اور ریشم کی قیمت میں اسکو
خریدتے ہیں وردانہ ایک بڑا گاؤں ہے وہاں
جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ بھی اچھی زندنیجی ہے
اور ملکوں سے تاجر آتے اور جس طرح ابھی
لوگ زندنیجی خرید کرلے جاتے ہیں تجار
بھی یہ کپڑے شام، مصر اور روم کے شہروں
میں لے جاتے، یہ خراسان کے کسی شہر میں
بنا نہیں جاتا اور کوئی بھی بادشاہ، امیر،
رئیس یا منصبدار ایسا نہ ہوتا کہ اس کے پاس
اس کپڑے کا لباس نہ ہوتا۔ اس کا رنگ
سرخ سفید اور ہرا ہوتا اور آج زندنیجی تمام
ملکوں میں بہت مشہور ہے۔

یاقوت نے زندنہ اور زندنیجی کے بارے میں تقریباً وہی اطلاع بہم پہنچائی ہے
جو تاریخ بخارا میں ہے، مثلاً وہ لکھتا ہے:
ماوراء النہر میں بخارا کے گاؤں میں ایک گاؤں زندنہ ہے، اس کے اور بخارا کے
درمیان ۴ فرسخ[1] کا فاصلہ بجانب شمال ہے، اسی قریہ کی طرف منسوب ہے زندنیجی (باضافہ
جیم) کپڑا، اور یہ کپڑا کافی مشہور ہے، (یاقوت ۲/۹۵۲)

[1] ایک فرسخ = فرسنگ تین میل کا ہوتا ہے (فرہنگ معین)

استخری نے زندنہ اور بخارا کے درمیان ۴ فرسنخ کا فاصلہ لکھا ہے (ص ۳۱۵)
مقدسی لکھتا ہے کہ زندنہ کے اطراف میں کافی گاؤں ہیں، اس کے گرد دا گرد ایک
دیوار ہے جس میں جامع مسجد ہے (ص ۲۸۰)

راحت الصدور میں ہے کہ سلطان سنجر اپنے لباس میں زیادہ تکلف نہیں کرتا
تھا، اکثر زندنیجی یا سادہ[۱] عتابی کی قبا اور بھیڑ کے بچے کی پوستین کا نیمچہ[۲] پہنتا تھا (ص ۱۷۱)

جہانگشای جوینی ۱/ ۵۹ میں ہے:

بضاعت بیش از حد از ثیاب مذہب — اور بے حد و حساب ساز و سامان ریشمی،
و کرباس و زندنیجی و آنچہ لایق — سوتی اور زندنیجی کپڑوں کا اور جو کچھ مناسب
دانستہ اند — سمجھا گیا ہے۔

سیاست نامہ طبع شفر ص ۳۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ زندنیجی ان ترک غلاموں کی پوشاک کا
مخصوص کپڑا تھا جو سامانیوں اور سلجوقیوں کی خدمت میں نئے نئے داخل ہوتے تھے۔

تفصیلات بالا سے حسب ذیل واضح نتیجے نکلتے ہیں:

۱۔ زندنیجی زندنہ کی طرف منسوب ہے اور یہ زندنہ بخارا سے ۴ فرسنخ = ۱۲ میل
شمال میں ایک قریہ ہے۔

۲۔ زندنیجی سوتی کپڑا تھا جو عمدہ ہوتا تھا اور بڑے پیمانے پر اس کی برآمد ہوتی
تھی، دنیا کے اکثر ممالک میں اس کپڑے کی مانگ تھی۔

۳۔ اگرچہ اول اول اس کا مرکز زندنہ تھا مگر بعد میں بخارا کے گرد و نواح کے
اکثر دیہات میں زندنیجی کپڑا بنا جانے لگا۔

---

[۱] ایک قسم کا ابریشمی کپڑا ہے، لہریا اور لائن دار مگر سادہ ہوتا ہے [۲] صدری کا مترادف۔

۴۔ یہ کپڑا سادہ تھا مگر اکثر امرا اور بادشاہوں کے لباس اس سے بنتے
تھے بعض بادشاہوں نے سادگی کی وجہ سے اس کو اپنے مخصوص لباس میں شامل کر رکھا تھا

زندنیجی کی صحیح قرأت زندنیچی ہونی چاہیے اس کے قرائن یہ ہیں:

ا۔ جہانگیری (۱۸۳۰-۱۸۳۱) میں سوزنی کی یہ بیت بطور شاہد درج ہے:

ثنای منتخب گفتن بہ ہیچی — بہ از خلعت گرفتن زندنیچی

ہیچی کا قافیہ زندنیچی ہوگا نہ زندنیجی

ب۔ چی لاحقے کا ایک اور لفظ غزنیچی (تاریخ بیہقی طبع فیاض ص ۲۸۱) اس
طرح آیا ہے:

دہ سپر کشان مردی و پیادہ، سہ ہزار سگزی و غزنیچی و ہریوہ و بلخی و سرخسی،
و لشکر بسیار و اعیان و اولیا و ارکان دولت۔

ڈاکٹر فیاض نے غزنیچی پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

غزنیچی (و شاید با جیم فارسی) محتمل است کہ منسوب بہ غزنی باشد چنانچہ ہم
اکنون منسوب بہ انزلی را انزلی چی و منسوب بہ ویرانی (دہی در خراسان) را
ویرانی چی می گویند و گویا این لفظ مخصوص زبان عامیانہ۔

ہندوستان میں اس لاحقے کا استعمال ایک آدھ لفظ میں ملتا ہے، مثلاً
"مڈل" میں پڑھنے والے لڑکے کو مڈل چی کہتے ہیں لیکن یہ تحقیر کی صورت ہے۔

اکثر عربی ماخذ میں فارسی صورت زندنیچی کے بجائے زندنیجہ ہے، یہی زندنیجہ
زندنیچی کی اصل ہے، لیکن چونکہ جی کے بجائے چی کا لاحقہ نسبت کے لیے آیا ہے، قدیم میں
چ بھی ج کی طرح لکھا جاتا تھا اس لیے اکثر کتابوں میں جیم فارسی کے بجائے جیم عربی ہی

(باقی)

ملتی ہے۔

ذیل میں ان فارسی فرہنگوں کے مطالب اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں جن میں لفظ زندنیچی آیا ہے:

فرہنگ قواس ص ۱۵۲: زندنیچی جامہ ایست، خاقانی گوید:

چو باد زندنیچی کہسار برکشد | بر خاک وخارہ سندس ودیبا برافگند

زفان گویا: زندنیچی جامہ ایست ستبر افریشمی اہار دادہ

بحر الفضایل (خطی): زندنیچی جامۂ اہار دادہ

مدار الافاضل ۲: ۳۹۰-۳۹۱: زندنیچی جیم فارسی جامہ[1] ستبر ابریشمی زندن[2] بفتح نام شہری، زندنیچی بجیم پارسی جامہ ایست منسوب باد

جہانگیری ۱۸۳۰-۱۸۳۱: زندنیچی با جیم عربی مکسور جامہ باشد ریسمانی کہ انرا لبس سفتہ باشند: حکیم سوزنی فرماید

ثنای منتخب گفتن بہ، ہیچی | بہ از خلعت گرفتن زندنیچی

حکیم خاقانی در صفت بہار گوید

چو باد زندنیچی کہسار برکشد | بر خاک وخارہ سندس[3] خضرا برافگند

یہی معنی و آخری بیت بطور شاہد رشیدی میں درج ہے لیکن لفظ زندنیچی ہے نہ زندنیچی؛

برہان ۱۰۳۸: زندنیچی بفتح وکسر[4] ثالث وجیم فارسی ہردو تحتانی مجہول رسیدہ،

---

[1] تصحیف ستبر [2] تصحیح زندنہ ہے [3] یہ بیت فرہنگ قواس میں آئی ہے۔ اس میں: سندس ودیبا ہے، نسخہ بدل: دیوان خاقانی، اس میں زندنیچی اور سندس ودیبا ہے [4] زندنہ میں حرف سوم دال ہے جو بقول یاقوت مفتوح ہے پس برہان کا مکسور قرار دینا درست نہیں۔

جامہ فراخ ریسمانی سفید گندہ[1] وہنگفت[2] وسطبری[3] باشد کہ پارچۂ آن را بسیار سفت باختہ باشند وبعضی گویند زندنیچی[4] پارچہ باشد در نہایت درشتی وسفتی وسفیدی

فرہنگ معین ۲/۱۷۵۴:

زندنیچی منسوب بہ زندنہ، نوعی جامہ کہ در زندنہ بافند

فرہنگوں میں مندرج مطالب تاریخ بخارا سے چند اعتبار سے مختلف ہیں:

۱۔ تاریخ بخارا وغیرہ میں لفظ زندنیچ ہے جبکہ اکثر لغات میں زندنیچی ہے یعنی جیم فارسی اور جیم عربی کے فرق کے ساتھ، البتہ ڈاکٹر معین نے زندنیچ ہی لکھا ہے۔

۲۔ تاریخ بخارا میں ہے کہ یہ سوت (کرباس) سے بنا جاتا ہے، جب کہ اکثر فرہنگوں میں اس کو ابریشمی بتایا گیا ہے اور بعض کتابوں میں اس کو لباس سمجھا ہے لیکن دراصل یہ ایک مخصوص کپڑا ہے جو زندنہ اور بخارا کے گرد وپیش گاؤں میں بنا جاتا ہے

۳۔ تاریخ بخارا اس کو اچھا کپڑا لکھا گیا ہے لیکن بعد کی فرہنگوں میں اس کو موٹا اور سخت کپڑا بتایا گیا ہے جو پہننے سے زیادہ پردہ وغیرہ کے کام میں آتا ہے۔

یہ ایک لفظ کے سلسلے کی مختصر گذارش ہے جس کے تلفظ اور معانی میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے، دراصل یہ ایک گاؤں زندنہ کی طرف منسوب ہے۔ فارسی میں کم از کم ایک اور کپڑا ہے جو ایک جگہ کی طرف منسوب ہے اور وہ ششتری جو اہک

---

[1] تا [3] یہ تینوں ہم معنی ہیں، موٹے کے معنی میں، ربا ایک کا متضاد [4] معین نے حاشیے میں لکھا ہے زندنیچی مصحف زندنیچی منسوب بہ زندنیج یاقوت در معجم البلدان گوید: بفتح اول وسوم وچہارم قریۂ بزرگی از قرای بخارا بما وراء النہر.. بدین قریہ منسوب است اثیاب زندنیجیہ نیز پا درث جیم واین جامہ ہا مشہور است۔

قسم کا ریشمی کپڑا ہے اور ششتر کی طرف منسوب ہے یہ خوزستان میں ایک قدیم شہر ہے ششتر کا تلفظ شوشتر بھی ہے، اس کا مخفف شوشش ہے اور یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو شوشش کے نام سے آج بھی موجود ہے، پس شوشتر یا ششتر کے دو معنی ٹھہرے۔

ا۔ شوشتر یا ششتر کا رہنے والا،

ب۔ ایک قسم کا کپڑا۔

انوری کا ایک شعر یہ ہے:

آنکہ از امعای کرمی از لعاب چند برگ
کار او باشد نہادن کارگاہ ششتری

سراجی کہتا ہے:

روز و شب آن سرو زیر پرنیاں کردہ نہاں
سال و مہ آن مشتری در ششتری کردہ قرار (دیوان ۱۶۰)

تا بچہ بد مشتری در نور و تابش بر سہا
تا نبا ششتری در قدر و قیمت چون گلیم (ص ۲۴۰)

اگر فارسی میں کپڑوں کے نام کے سلسلے میں تحقیق ہو تو کچھ نام ایسے ضرور مل جائیں گے جو کسی جگہ کی طرف منسوب ہونگے، اس طرح کی تحقیق دلچسپی سے خالی نہ ہوگی اور نیز متون کے مطالعے میں ان سے مدد مل سکتی ہے، یہی صورت ہندوستانی کپڑوں کے نام کی ہے، انکے قدیم ناموں کی تلاش اور ان کے معانی کا تعین نہایت دلچسپ مطالعہ ہوگا۔

تلخیص و تبصرہ

جمع و تدوین قرآن مجید اور مستشرقین

از
محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

حال ہی میں مستشرقین کی مرتب کردہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد پنجم کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے، یہ انگریزی اور فرنچ دونوں زبانوں میں ہے، اس ضخیم کتاب میں "قرآن" کے عنوان کے تحت مستشرق ولش کا ایک مفصل مضمون شامل ہے، جس میں انھوں نے وہ سب اعتراضات یکجا کر دیئے ہیں، جو تقریباً دو صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔

عہد نبوی میں جمع و ترتیب کی کیفیت

جمع و تدوین قرآن کو مستشرقین نے خاص طور پر اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے جس کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے متن کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیں؛ اس سلسلہ میں ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ پورا قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدون نہیں ہوا، پھر وہ اس بے بنیاد اعتراض کا جواب بھی اپنے ہی مفروضات و قیاسات کی روشنی میں ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ بعض کے نزدیک کاتبین وحی کی کمی سے ایسا ہوا اور بعض مستشرقین نے تو اس کی یہ مضحکہ خیز توجیہ کی ہے کہ "چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرب قیامت کا حد درجہ شدید احساس تھا اور

آپؐ جانتے تھے کہ یہ تمام علوم قیامت آنے کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں گے اس لیے آپؐ نے قرآن مجید کو جمع کرنے کی ضرورت پر سرے سے زور ہی نہیں دیا۔"

دراصل مستشرقین کی یہ دونوں باتیں لغو اور حقیقت کے برعکس ہیں، ان کا یہ کہنا کہ کاتبان وحی کی قلت تعداد اس میں مانع ہوئی ان کے مطالعہ اور غور و فکر کی کمی کا نتیجہ ہے، مختلف روایتوں کے مطابق کاتبین وحی کی تعداد چوالیس[44] تھی۔ چالیس کا اعتراف تو خود مستشرق بلاشیر نے کیا ہے، نزول قرآن کے زمانہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین کے ذریعہ نازل شدہ قرآن مجید کا املا کرواتے تھے اور خود آپؐ ان آیتوں کے محل و مقام کو بھی متعین فرما دیتے تھے جیسا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کے اس ارشاد سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

كنا عند رسول الله صلى الله	ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
عليه وسلم نؤلف القرآن	مختلف ٹکڑوں سے قرآن مجید کو مرتب
من الرقاع	کرتے تھے،

اسی طرح مستشرق کازانوف کا یہ خیال کہ قرب قیامت کی شدت احساس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو مدون کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، مسلمان دانشوروں سے پہلے خود مستشرقین کے طبقہ میں رد کیا جا چکا ہے، چنانچہ بلاشیر نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے:

"کازانوف کی اس رائے کا نہ تو علمی حلقوں میں کوئی وزن ہے اور نہ ہی اس کا علم سے کوئی تعلق ہے۔"

تاہم بلاشیر نے اس کی تردید میں اپنے خود ساختہ خیالات کی ترجمانی کی ہے جو اسلامی

نقطۂ نظر سے غلط ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یوم آخرت کا انذار اور دھمکی صرف مکی دور تک محدود تھی مدنی عہد میں جو اسلامی شریعت کی ترقی کا دور تھا یہ چیز مفقود ہے۔"

کازانوف کے اس غیر علمی خیال کی سب سے عمدہ تردید فرانس کے ایک مسلمان مصنف ناصر الدین دینیہ نے اپنی کتاب "الشرق فی نظر الغرب" میں کی ہے،

علمائے اسلام نے عہد نبویؐ میں قرآن مجید کے مدون نہ ہونے کے اسباب و وجوہ پر مفصل بحث و گفتگو کی ہے، ان کے خیال میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ چونکہ قرآن مجید وقتاً فوقتاً تیئیس[23] برس کی مدت میں نازل ہوتا رہا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تردد لاحق رہتا تھا کہ معلوم نہیں کب کون آیت نازل ہو اور کون سی منسوخ ہو جائے یا کسی آیت کا حکم تو برقرار رہے مگر اس کی تلاوت منسوخ کر دی جائے تاہم یہ امر واقعہ تھا کہ پورا قرآن مجید عہد نبویؐ ہی میں لکھا جا چکا تھا گو وہ ایک مصحف میں بین الدفتین جمع نہ تھا، بلکہ وہ متفرق کاغذ کے پرزوں اور دوسری چیزوں پر لکھا ہوا تھا علاوہ ازیں وہ صحابہ کرامؓ کے سینوں میں بھی محفوظ تھا، جن کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ عربوں کے حفظ و ضبط کی غیر معمولی قوت پر بہت لکھا جا چکا ہے،

جمع و تدوین کا زمانہ

مستشرقین کی جانب سے ایک سوال یہ بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید کا جامع اول کون ہے، اس بارہ میں اس گروہ نے غیر معتبر روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"ایک روایت میں ہے کہ کسی موقع پر حضرت عمرؓ نے کوئی آیت دریافت کی تو انہیں بتایا گیا کہ وہ فلاں صاحب کو یاد تھی جو غزوہ یمامہ میں شہید ہو گئے، اس پر

حضرت عمرؓ کو سخت افسوس ہوا اور انھوں نے قرآن مجید کو جمع کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ اس امر کے بموجب سب سے پہلے قرآن مجید ایک مصحف میں جمع کیا گیا لیکن بعض دوسری روایتوں کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے یہ کام شروع کیا تھا اور حضرت عمرؓ نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی نے جمع قرآن کا کام انجام دیا اور حضرت عمرؓ نے اس کی تدوین کی"۔

حقیقت یہ ہے کہ ناقابل اعتبار اور متضاد روایتوں کو یکجا کر کے انھیں اپنے مفاد میں استعمال کرنے میں مستشرقین کو بڑی مہارت اور چابکدستی حاصل ہے، یہاں بھی انھوں نے متن قرآن کی جمع و ترتیب میں غلط فہمیاں پیدا کر کے اس کے بارے میں مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دینے اور اس کی تاریخی حقیقت کو مجروح کرنے کے لیے روایتوں کے دامن میں پناہ لی ہے۔

مقالہ نگار نے حضرت عمرؓ کی جس روایت کا ذکر کیا ہے اس کو حافظ ابن حجرؒ (متوفی ۸۵۲ھ) نے منقطع قرار دیا ہے اور جن روایتوں سے اس بارہ میں حضرت عمرؓ کی اولیت کا ثبوت ملتا ہے ان کے متعلق بھی حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے اس کام کا مشورہ دیا تھا،

اسی طرح مقالہ نگار کا یہ بیان کہ حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن کی ابتدا کی مگر اس کی تدوین حضرت عمرؓ کے ہاتھوں ہوئی، دراصل مستشرق بلاشیر کا ایک خود ساختہ خیال ہے جس کی تردید صحیح بخاری کی ایک مشہور روایت سے بھی ہوتی ہے، جس کے آخری حصہ میں حضرت زیدؓ بن ثابت کا یہ قول نقل ہوا ہے:

حتی وجدت آخر سورۃ التوبۃ	بالآخر مجھ کو سورہ توبہ کی آخری آیت
مع ابی خزیمۃ الانصاری لم	(لقد جاءکم رسول..... الخ)
اجدھا مع أحد غیرہ (لقد	حضرت ابوخزیمہ انصاریؓ کے پاس ملی
جاءکم رسول من انفسکم	جو اور کسی کے پاس نہ تھی،
عزیز علیہ ما عنتم)	

حضرت زیدؓ بن ثابت کے اس ارشاد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کا کام عہد صدیقی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

عام صحابہ کو نظر انداز کرنے کا الزام

بلاشیر کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع و تدوین قرآن کے مشورہ میں عام مسلمانوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ تمام تر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی ذاتی دلچسپی اور جد و جہد کا نتیجہ تھا جس کو عام مسلمانوں میں بھی رائج کر دیا گیا، وہ لکھتے ہیں:

"طبعاً مسلم معاشرہ کو وحی الٰہی کے ایک مدون نسخہ کی حاجت تھی اور ظاہر ہے یہ نسخہ ایسا ہی ہو سکتا تھا جو عام مسلمانوں کی رائے سے مدون کیا گیا ہوتا کہ اسکو عوامی مقبولیت حاصل ہو، حضرت ابوبکرؓ کے صحیفے اس معیار پر پورے نہیں اترتے، کیونکہ ان کی حیثیت حضرت ابوبکرؓ کی ذاتی ملکیت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کسی کے ذہن میں یہ بات نہ تھی کہ وہ بحیثیت خلیفہ عام مسلمانوں پر اس کو لازم قرار دیں"۔

جمع قرآن کا بنیادی محرک بلاشبہ غزوہ یمامہ میں ستر حفاظ صحابہ کی بیک وقت شہادت کا واقعہ تھا جس کے بعد ہی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی توجہ اس اہم کام کی طرف مبذول ہوئی، مگر کیا اس کو ان دونوں بزرگوں کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے

یا اس میں عام مسلم معاشرہ کی مصلحت مضمر تھی، بالغرض اگر ایسا ہی ہوتا تو ان دونوں بزرگوں کے لیے عام مسلمانوں کے تعاون کے بغیر خود ہی یہ کام انجام دینا کس طرح ممکن ہوتا، سب سے بڑا تعاون تو حضرت زیدؓ بن ثابت کا تھا جن کو جب اس کام کی زحمت دی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ

فواللہ لو کلفونی نقل جبال	بخدا اگر وہ لوگ مجھ سے پہاڑ کا بوجھ
ما کان أثقل علی مما أمرانی	بھی اٹھانے کے لیے کہتے تو یہ کام میرے
بہ من جمع القرآن	لیے قرآن کریم کو جمع کرنے کے مقابلے
	میں زیادہ ہلکا ہوتا،

بلاشیر نے اس بارے میں اس امر سے یہ غلط فہمی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے ہی بعض صحابہ کرام نے بھی انفرادی طور پر اس کام کو انجام دیا تھا، مثلاً حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت ابودرداؓ وابن السکینؓ وغیرہ

ایک تاریخی غلطی کا اعادہ

دراصل الکامل ابن اثیر اور کتاب النشر ابن جزری میں حضرت عثمانؓ کے عہد مبارک میں قرآن مجید کے مستند نسخہ کی نقلیں تیار کرنے کا سن ۳۰ھ لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ کام ۲۵ھ میں ہوا، جیسا کہ ابن حجرؒ نے فتح الباری جلد ۹ ص ۱۰ پر اس کی مکمل وضاحت کر دی ہے مگر جو مستشرقین قرآن مجید کے تاریخی پہلو پر بحث کرتے ہیں وہ اپنی مقصد برآری کے لیے قصداً اس غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں

بلاشیر نے بھی اس تاریخی غلطی کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ابن ابی داؤد کے بیان کے مطابق حضرت ابی ابن کعبؓ بھی اس وقت موجود تھے جبکہ دوسرے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۳۰ھ سے کم از کم دو سال پہلے ہی انتقال

کر چکے تھے،

حضرت زید بن ثابتؓ کی مخلصانہ جدوجہد پر اثر پذیری کا بہتان

اکثر مستشرقین نے اس باب میں حضرت زیدؓ بن ثابت کی شخصیت کو بھی متہم کیا ہے ان کے خیال میں وہ مختلف عوامل سے متاثر تھے جنکے اثرات کی کارفرمائی لامحالہ اس کام پر بھی اثر انداز ہوئی لیکن یہ ساری باتیں بے بنیاد ہیں حضرت زیدؓ اسی وقت سے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کتابت وحی پر مامور کیا تھا اپنی وفات (۴۵ھ) تک ممتاز سیرت و شخصیت کے مالک رہے، سوسائٹی میں ان کے اونچے درجہ و مرتبہ نیز ان کی حفظ و یادداشت کی قوت و صلاحیت کا اعتراف مستشرقین کو بھی ہے، صحابہ کرام کی پوری جماعت میں وہ ان اوصاف و خصوصیات کے لحاظ سے بے نظیر تھے، اکثر صحابہؓ نے ان کی عظمت شان غیر معمولی فضل و کمال اور کتابت وحی کی عظیم الشان خدمت انجام دینے کا ذکر بھی کیا ہے، امیر المومنین حضرت ابوبکرؓ کو اس بارہ میں ان پر کتنا اعتماد تھا اس کا اندازہ ان کے اس ارشاد گرامی سے کیا جا سکتا ہے

انک رجل شاب عاقل لانتہمک	بیشک تم نوجوان اور ہوش مند بھی
وقد کنت تکتب الوحی	ہو، تم پر کوئی اتہام بھی نہیں ہے اور
	تم وحی بھی لکھا کرتے تھے۔

حافظ ابن حجرؒ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی چار صفات گنائی ہیں جو تمام اس کام کے مخصوص تھیں، ۱- نوجوان ہونا تاکہ وہ اس اہم کام کو تندہی اور محنت سے انجام دے سکیں، ۲- ہوش مند ہونا اس بنا پر وہ اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں، ۳- متہم و مجروح نہ ہونا کہ ان کا نفس کسی برائی اور غلط رجحان کی طرف مائل ہو

۴۔ کاتب وحی ہونا کہ یہ سعادت اور شرف ان کو پہلے سے حاصل ہے، چاروں اوصاف فرداً فرداً تو اور لوگوں میں بھی مل سکتے ہیں مگر حضرت زیدؓ کے اندر ان سب کا جمع ہونا ان کی نمایاں خصوصیت ہے"،

مزید براں حضرت زید بن ثابتؓ اس وقت بھی موجود تھے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دنوں میں حضرت جبریل علیہ السلام سے دو مرتبہ آپؐ سے قرآن مجید سنا اور خود آپؐ کو سنایا، علاوہ ازیں وہ تمام صحابہ میں قرآن مجید کے حفظ و ضبط اور اس کی مختلف قرأت سے واقفیت میں مشہور و ممتاز تھے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے یہ کام تنہا نہیں انجام دیا، ابن ابی داود کی روایت ہے

ان ابا بکرؓ قال لعمرؓ و لزیدؓ	حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ اور
اقعدا علی باب المسجد فمن	حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ تم دونوں
جاء کما بشاھدین علیٰ شئی	مسجد نبویؐ کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ اور
من کتاب اللہ فاکتباہ۔	جو شخص دو گواہوں کے ساتھ قرآن
	کا کوئی حصہ پیش کرے، اسے لکھ لو،

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت گو منقطع ہے لیکن اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اسی طرح ابن ابی داؤد ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ "تدوین قرآن کے وقت حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کا کوئی حصہ سنا یا لکھا ہو وہ اسے پیش کرے، صحابہ کا معمول تھا کہ وہ قرآن مجید کو اوراق، پتھر کی تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے اور کسی سے بھی قرآن کا کوئی حصہ بغیر دو گواہوں کی شہادت کے قبول نہیں کیا جاتا تھا"

ان دونوں روایتوں میں اس کا ذکر ہے کہ اس اہم کام میں حضرت عمرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کی معاونت کی تھی، مگر اس بارہ میں خود حضرت زیدؓ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ وہ محض حافظہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے، چنانچہ سورہ توبہ کے آخر کی آیت کے سلسلہ میں ان کا بیان ہے کہ وہ انھیں حضرت ابو خزیمہ انصاریؓ کے علاوہ اور کسی کے یہاں نہیں ملی، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیت صرف انہیں کے پاس لکھی ہوئی موجود تھی ورنہ یہ زبانی تو انہیں خود بھی اور دوسرے بہت سے صحابہ کو بھی یاد تھی اور حفظ کے باوجود اس کے مطابق لکھے ہوئے کی تلاش سے ان کی انتہائی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔

مصحف عثمانی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

مقالہ نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ "حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کے دوسرے تمام نسخوں کو جلا دیا اور صرف سرکاری نسخوں کو برقرار رکھا اور یہی حکم تمام شہروں میں نافذ کر دیا گیا، البتہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے ہمنواؤں نے اس کی پرزور مزاحمت کی" پھر اس مخالفت کے اسباب و علل پر طویل گفتگو کرتے ہوئے طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علیحدہ مصحف کا ذکر مبالغہ آرائی سے کیا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مصحف عثمانی کی مسلمہ صحت و صداقت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، مقالہ نگار نے بھی یہی کیا ہے، اور اس نے اس بارہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جانب منسوب اس تقریر کو بھی نقل کیا ہے؛

یا معشر المسلمین: اعزل	اے مسلمانو! میں مصاحف کی

عن نسخ المصاحف و تیوکلا	نقل نویسی سے معزول کر دیا گیا
دجل واللہ لقد أسلمت	اور ایک ایسے شخص کو اس پر مامور
وانہ لفی صلب دجل کافر	کیا گیا جو اس وقت ایک کافر کے صلب میں تھا جبکہ میں مسلمان ہو چکا تھا۔

بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا کلام ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ جمع و تدوین قرآن مجید کے مخالف تھے، بلکہ ان کی تنقید محض جمع قرآن کے ذمہ داروں پر تھی، چونکہ وہ حضرت زید بن ثابتؓ کے مقابلہ میں معمر اور قدیم الاسلام تھے اور پھر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فن قرأت کے ائمہ میں شمار کیا تھا، چنانچہ آپؐ نے ان کے بارہ میں فرمایا تھا۔

خذوا القرآن عن اربعة:	قرآن مجید چار آدمیوں سے سیکھو،
عبداللہ وسالم مولی ابی	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت
حذیفة ومعاذ بن جبل و	سالمؓ غلام حضرت ابوحذیفہؓ، حضرت
ابی بن کعب۔	معاذ بن جبلؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ

اس بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے آپ کو اس کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے رہے ہوں گے مگر جب ان کو اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہو گیا اور اپنے موقف کی غلطی کا بخوبی احساس ہو گیا تو انھوں نے اس سے رجوع کر لیا اور برضا ورغبت امت اسلامی کی وحدت و اجتماعیت کو برقرار رکھا،

خاتمہ یہ مستشرقین کے بعض اعتراضات اور غلط بیانیوں کی ایک جھلک ہے

جن کو وہ اپنی تمام کتابوں میں بار بار دہرا کر قرآنی متن کو مشکوک اور نا معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے، ارشاد باری ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا	بیشک ہم ہی نے اس نصیحت کو اتارا
لہ لحافظون۔	ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان و محافظ ہیں۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اسلامی کتب خانوں میں ایسی مستند اور محققانہ کتابوں کی کمی ہے جن میں متن قرآن کی تاریخ مرتب اور مرحلہ وار درج کی گئی ہے، صرف ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف اس سلسلہ میں واحد مأخذ ہے جس کو مستشرق جفری نے شایع کیا ہے، مگر اس کو بھی دوبارہ ایڈٹ کر کے شایع کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کتاب کے عمیق مطالعہ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے تاریخی مباحث تشنہ ہیں اور اس میں ایک موضوع سے متعلق مختلف متضاد روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں، اگر یہ اہم کام مسلمانوں کی جانب سے انجام پا جائے تو متضاد روایتوں کا سہارا لے کر کتاب اللہ پر طعن و تشنیع کی جو کوشش مستشرقین کر رہے ہیں اس کا سد باب ہو جائے گا۔

اخبار علمیہ

عہد حاضر میں قرآن مجید اور سائنس کے موضوع پر لکھنے والوں میں ڈاکٹر بوکائیل مورس کا نام اب محتاج تعارف نہیں، اس موضوع پر ان کی تحریریں بڑی وقعت و منزلت کی نظر سے دیکھی جارہی ہیں، ان کی ایک کتاب قرآن بائبل اور سائنس کو بھی خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ پیشہ کے لحاظ سے ایک طبیب ہیں، اب پیرس سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب REFLEXIONS SUR LE CORAN (ریفلکشنز آن دی قرآن) کے نام سے شایع ہوئی ہے، کتاب کے پہلے جزو میں تیونس یونیورسٹی کے پروفیسر طلبی محمد نے مطالعہ قرآن کے روحانی پہلوؤں سے بحث کی ہے اور مطالعہ و تفہیم قرآن کے اہم نکات پر عالمانہ گفتگو کی ہے، کتاب کا دوسرا جزو قرآن اور جدید سائنس کے عنوان سے ڈاکٹر بوکائیل مورس کی تحریر پر مشتمل ہے، اس میں جدید سائنسی اختراعات کا تجزیہ، آیات قرآنی کی روشنی میں کیا گیا ہے اور جنت، زمین، نباتات، حیوانات، انسانی تخلیق اور کائنات جیسے موضوعات زیر بحث آئے ہیں، ماضی میں حکمائے اسلام کے مطالعہ و تحقیق پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر بوکائیل کی رائے میں جدید سائنسی مصطلحات کا ترجمہ بڑی احتیاط کا متقاضی ہے، کیونکہ ان کے غلط ترجموں سے قرآنی آیات کی ترجمانی میں بھی غلطی کا صدور ممکن ہے، اس مفید کتاب کا ترجمہ انگریزی اور اردو میں بھی کیا جانا چاہیے۔

موجودہ دور میں جہاں مادی طور پر قدرت کے دفینوں اور خزینوں کی جستجو اور دریافت کا سلسلہ جاری ہے وہیں علم و حکمت کے پوشیدہ موتیوں کی بازیافت کی خبریں بھی برابر آتی رہتی ہیں، جزیرہ قبرص کے کتب خانوں میں اسلاف کے عہد زریں کے یہ موتی جابجا بکھرے ہوئے تھے، دو برس پہلے وہاں کے نیشنل آرکائیوز نے ترکی کے ادارہ (IRCICA) کو انہیں ایک لڑی میں پرو دینے کی ذمہ داری سپرد کی، اب معلوم ہوا ہے کہ محمود ثانی لائبریری کے ۱۶۶۴، کتب خانہ سلیمیہ کے ۲۵۲، نیشنل آرکائیوز کے ۱۱۵ اور لالیلی لائبریری کے ۶ مخطوطات کے بارے میں اطلاعات یکجا کرلی گئی ہیں، یہ قدیم اور اہم مخطوطات پچاسی فیصد عربی زبان میں ہیں اور باقی فارسی و ترکی زبان میں ہیں، نظر ثانی کے بعد یہ فہرست اب اشاعت کے مرحلے میں ہے،

ماضی میں یورپ میں اپنے آبا کی کتابیں دیکھ کر حساس دل سی پارہ ہوتے تھے اب ان کتابوں کے جمع و تدوین کی کوششیں ہو رہی ہیں، گذشتہ ماہ مئی میں ہنگری کے شہر پالاٹون الماوی میں ہنگری کی اکادمی آف سائنسز کے زیر اہتمام "مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ میں اسلامی زبانوں کے مخطوطات" کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد ہوا، مقصد یہ تھا کہ مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کے کتب خانوں میں موجود مخطوطات کا پتہ لگایا جائے، سمپوزیم میں علم مخطوطات کے ماہرین نے شرکت کی، اس کی مزید تفصیلات کا انتظار ہے۔

انسانی علوم و فنون کے ساتھ یہ اعتنا مشرق و مغرب میں یکساں طور پر نظر آتا ہے، چنانچہ جاپان میں گذشتہ سال نومبر میں ایک نہایت اہم کانفرنس "اسلام میں مدنیت" کے موضوع پر ہوئی تھی، اس کا اہتمام جاپان کی وزارت تعلیم

سائنس اور کلچر نے کیا تھا، شاہ جاپان اس کے اعزازی صدر تھے، علم سماجیات کے تقریباً ۲۸۸ ماہرین و محققین نے اس میں شرکت کی، برازیل، کیمرون، کناڈا، فرانس، مشرقی جرمنی، اٹلی، کینیا، مراکش، پاکستان، سوئٹزرلینڈ، سوڈان، تنزانیہ، برطانیہ اور روس سے ایک ایک، چین، لبنان، ملیشیا اور سعودی عرب سے دو دو، ہندوستان، انڈونیشیا، کویت، نائجیریا، فلسطین اور ترکی سے تین تین، شام سے چار، ایران سے پانچ، مصر سے آٹھ، امریکہ سے بارہ اور جاپان کے ۲۱۹ اسکالروں نے اس میں شرکت کی، کانفرنس کے ۱۲ سیشن ہوئے چند موضوعات سے اس کانفرنس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے مثلاً ۱۔ مطالعہ مدنیت کے تقابلی پہلو ۲۔ مطالعہ مدنیت کے مناہج ۳۔ شہری منصوبہ بندی اور شہری معاشرہ کی ساخت ۴۔ حکمائے اسلام کے مدنی نظریات ۵۔ مدنیت اور طور زندگی ۶۔ دیہاتی اور شہری معاشرہ کا باہمی ربط ۷۔ اسلام میں مرکز کی اہمیت ۸۔ معاشی تغیرات میں جدید شہر ۹۔ اختیار شہریت اور نسلی و مذہبی تحریکیں ۱۰۔ شہر اور سیاسی اقتدار وغیرہ اس اہم سیمنار کے مقالات کا مجموعہ پانچ جلدوں میں "پروسیڈنگ آف دی انٹرنیشنل کانفرنس آن اربنزم" کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔ جسے مندرجۂ ذیل پتے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

DAISANSHOKAN CO. LTD, 1-16-15 OKUBO

SHINJUKUKU, TOKYD, JAPAN

پاکستان کا ادارہ 'مقتدرہ قومی زبان' اور اس کا ماہانہ ترجمان 'اخبار اردو' اس وقت اپنے فعال نگراں ڈاکٹر جمیل جالبی کی رہنمائی میں اردو زبان کی

خدمت کے لیے سرگرم عمل ہے۔ آج اردو کتابت کمپیوٹر کے جدید ترین مرحلہ میں ہے، نسخ اور نستعلیق دونوں اب برقی کتابت سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں گذشتہ سال لاہور اور کراچی کے بازاروں میں جدید ترین اردو کمپیوٹر تیار ہوئے اور ماضی کے مقابلہ میں ان کی قیمت بھی خاصی کم ہوئی، کتابت کے اس انقلاب کی داستان ماہنامہ 'اخبار اردو' نے اردو کمپیوٹر نمبر شایع کر کے سنائی ہے اس اہم شمارہ میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، حنیر لون، ڈاکٹر طارق عزیز، قاضی عزیز الرحمٰن عاصم، لبشارت علی سید وغیرہ کے مضامین نہایت مفید اور پر از معلومات ہیں، اردو زبان کے ناشرین کتب کے لیے اس خاص نمبر کا مطالعہ ضروری ہے اور مقتدرہ قومی زبان ہر اردو داں کی جانب سے شکریہ کا مستحق ہے۔

ہندوستان کے نیشنل پریس اور بڑے انگریزی اخبارات میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غیر مسلم صحافیوں کے مثبت خیالات کی جھلک کبھی کبھی ان سطروں میں پیش کر دی جاتی ہے، انگریزی کے مسلمان صحافیوں کی تحریروں میں عموماً مرعوبیت اور خفیف انداز فکر کا شکوہ کیا جاتا ہے مگر ٹائمز آف انڈیا کے ایک شمارہ میں اکبر، ایس احمد نے اپنے مضمون میں مغرب کے سیاسی اور تہذیبی تسلط سے مسلمانوں کے نفور کا دلچسپ تجزیہ کیا ہے

CANTHEWESTUNDERSTAND WHY MUSLIMS SAYNOTO BLUEJEAN ?

کے عنوان کے تحت انھوں نے لکھا کہ "۔۔۔ یورپ اسلام کو مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر رہا، وہ اسلام کو صرف اس لیے باغی مذہب سے تعبیر کرتا ہے کہ اس نے مغربی افکار و اقدار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔ کمیونزم کے زوال کے بعد اب اسلام کو مغربی تہذیب کا سب سے بڑا حریف ثابت کیا جا رہا ہے،

"...... اسلام کی صحیح معرفت آیندہ برسوں میں نزاکت کی حامل ہوگی، رشدی کے قضیہ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ مغرب کے روشن خیال حریت پسندوں کے لیے اسٹیریو ٹائپ ہوجانا کتنا آسان ہے، فرد واحد کے صرف ایک فعل پر اعتراض کی پاداش میں مغرب نے اسلام کی عالمی تہذیب کی مذمت کی، ذرائع ابلاغ میں اسلام کو مہمل، نامعقول، متعصب اور تفرقہ انگیز جیسے الفاظ سے یاد کیا گیا، حالانکہ آج بھی اسلامی معاشرہ ایک آفاقی تہذیب کا داعی ہے جہاں روح اور مادہ کا توازن، خدا ترسی اور خاندان کی ذمہ داری، خاندان کے معمر افراد، عورتوں اور بچوں کی نگہداشت کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی کارفرمائی جاری ہے..."

روشن خیالی، حریت افکار اور آزادی اظہار رائے کے بلند بانگ مغربی دعووں کا ڈھونگ اس خبر سے ظاہر ہے کہ ملکہ الزبتھ ایک ایسی کتاب پر پابندی عائد کرنے پر مصر ہیں جس میں شاہی خاندان کے چند اسرار سربستہ کی نقاب کشائی کی گئی ہے COURTING DISASTERS نامی اس کتاب کے مصنف میلکم بارکر ہیں جو سنہ ۸۳ء تک شاہی خاندان میں ایک کلرک کی حیثیت سے برسرکار تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے برطانیہ کے شاہی محلات میں کثرت شراب نوشی اور ناجائز جنسی تعلقات کی داستانیں رقم کی ہیں، ایک تصویر میں بستر پر ملکہ برطانیہ جس انداز سے استراحت فرما رہی ہیں اس کی اشاعت بھی ملکہ کے غیظ و غضب کا باعث بنی، اس کتاب کے بعض اجزا فرانس کے رسالہ PARIS MATCH میں بھی شایع ہوئے ہیں لیکن برطانوی ایڈیشن میں ان کو خارج کر دیا گیا ہے۔

یہ خبر باعث مسرت ہے کہ ہندوستان میں اس سال حکومت کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ اردو کی مشہور افسانہ و ناول نگار مصنفہ محترمہ قرۃ العین حیدر کو دیا گیا ہے اسکے لیے وہ تمام اردو دنیا کی جانب سے تحسین و مبارکباد کی حقدار ہیں۔

ع۔ ص۔

معارف کی ڈاک

جناب مالک رام صاحب کا مکتوب گرامی

۲۷ جولائی ۱۹۹۰ء

محب گرامی قدر، آداب

معارف کے شمارہ جون ۱۹۹۰ء میں پروفیسر عبد السبحان (کلکتہ) کا مضمون "عبد الغفور نساخ" شامل ہے۔ اس کے حواشی میں وہ فرماتے ہیں (ص ۴۷۱)

"خود نوشت سوانح حیات نساخ" کے انگریزی دیباچے میں راقم الحروف (یعنی پروفیسر عبد السبحان) نے پہلی شوال ۱۲۴۹ھ (تاریخ ولادت نساخ) کو ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ قرار دیا ہے۔ مگر جناب مالک رام نے خود نوشت پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے غلط بتایا ہے (آجکل، نئی دہلی، مئی ۱۹۸۸ء) ان کے خیال میں مذکورہ عربی تاریخ کا تطابق ۳۱ جنوری کے بجائے ۱۱ یا ۱۲ فروری[1] ہے، تبصرہ نگار کا حساب صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس بات کی سند موجود ہے کہ نساخ ۳۱ جنوری کو اپنی عمر کا ۵۵ سال پورا کر کے اسی دن اس زمانے کے قاعدہ کے رو سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن حاصل کی (انگریزی اخبار اسٹیٹمین، کلکتہ: مورخہ ۱۶ جون ۱۸۸۹ء)"

[1] آجکل کے مشارٌ الیہ تبصرہ میں ۱۱/۱۲ جنوری چھپ گیا ہے۔ خدا معلوم کیسے! صحیح 'فروری' ہے۔ اسی لیے میں نے یہاں بھی 'جنوری' کی جگہ 'فروری' کر دیا ہے۔ اس سے پروفیسر صاحب موصوف کے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا

گویا پانیر غلطی پر برہان قاطع اسٹیٹسمین کی خبر ہے۔ اس پر مجھے بے ساختہ اکبر کا وہ مشہور شعر یاد آگیا:

بات وہ ہے، جو پانیر میں چھپے   کام وہ ہے، جو ہو گورنمنٹ

وہ خود لکھتے ہیں کہ ناسخ کی ولادت روز عید الفطر ۱۲۴۹ھ کو ہوئی اور اسے مطابق سمجھتے ہیں ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ء کے۔ کیوں؟ کیونکہ اسٹیٹسمین میں ان کی ۵۵ برس کی عمر میں ملازمت سے سبکدوشی ۳۱ جنوری ۱۸۸۹ء کو چھپی ہے۔ ظاہر ہے، کیلنڈر، جنتریاں، سورج چاند کی گردش اور ان کا طلوع و غروب ــ سب غلط ہو سکتے ہیں لیکن اسٹیٹسمین کی خبر کیونکر غلط ہو سکتی ہے!

بیا کہ ماسپر انداختیم اگر جنگ است

انھیں چاہیے تھا کہ کوئی تقابلی جنتری (انگریزی یا اردو) دیکھ لیتے۔ اس سے انھیں معلوم ہو جاتا کہ یکم شوال ۱۲۴۹ھ (عید الفطر) واقعی مطابق ہے ۱۱/۱۲ فروری ۱۸۳۴ء کے۔

رہا ناسخ کا ۳۱ جنوری ۱۸۸۹ء کو ملازمت سے سبکدوش ہونا! تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تاریخ کو وہ اس لیے سبکدوش ہوئے کہ انھوں نے سرکاری ملازمت میں داخل ہوتے وقت اپنی تاریخ ولادت غلط لکھی تھی!

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام۔

ڈاکٹر محمد صابر خاں کا گرامی نامہ

کلکتہ ۳۰ جولائی سنہ ۹۰ء

مکرمی جناب ضیاء الدین صاحب اصلاحی،

السلام علیکم!

گذارش یہ ہے کہ معارف جولائی کا شمارہ موصول ہوا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرا مقالہ بعنوان "علی ابن ربن الطبری کی فردوس الحکمۃ میں آیوروید پر ایک مقالہ" اس میں شایع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں چند ضروری باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں اور آپ سے درخواست ہے کہ آپ میرا یہ خط معارف میں قارئین کی معلومات کے لیے شایع کر دیں۔

یہ مقالہ مکمل نہیں تھا اس کا صرف نصف حصہ آپ نے شایع کیا اور بقیہ میں نے ابھی نہیں لکھا ہے، مجبوری یہ ہے کہ میں فوراً نہیں لکھ سکتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک طویل علمی و تعلیمی سفر میں ۱۵ اگست کو ہندوستان سے روانہ ہو رہا ہوں۔ انشاء اللہ واپسی وسط ستمبر تک ہوگی اس کے بعد مقالے کا بقیہ حصہ لکھ کر آپ کو بھیج دوں گا۔ امید ہے کہ آپ شایع کر دیں گے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ متن میں حواشی و تعلیقات کے نمبر سہواً نہیں دیئے گئے ہیں اس کی تلافی اب اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس مقالہ کے اہم ماخذ کی تفصیل اس کے خاتمے کے بعد شایع کر دی جائے مجھے امید ہے کہ آپ اس سے اتفاق کریں گے۔

معارف برابر مل رہا ہے شکریہ اور میں انھیں باقاعدہ و بلاناغہ پڑھ رہا ہوں امید کہ آپ ہر طرح مع الخیر ہوں گے۔

مجھے اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

فقط والسلام

آپ کا مخلص

محمد صابر خاں، کان اللہ لہ

مطبوعات جدیدہ

پاکستانی مطبوعات (۳)

میزان حصہ اول: مرتبہ جناب جاوید احمد الغامدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۲ قیمت ۳۵ روپیے، پتہ: دار الاشراق ۱۷۹۔ بی ابوبکر بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، پاکستان۔

لائق مصنف مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے ممتاز پاکستانی تلامذہ میں ہیں، انھوں نے زیر نظر کتاب میں رجم کے بارے میں اپنے اور اپنے استاذ محترم کے نقطۂ نظر کی مدلل وضاحت کی ہے اور اس کے بارے میں معترضین کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں، اس کے ساتھ ہی چند اور قرآنی مباحث پر بھی سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے، کتاب کے نو مضامین میں چار رجم کی بحث کے لیے مخصوص ہیں، ایک مضمون میں خود مولانا اصلاحی ہی کی تحریر بعینہ درج ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورہ نور میں زنا کی جو سزا مِأَةَ جَلْدَةٍ (سو کوڑے) بیان کی گئی ہے وہ عام ہے، اس میں نہ نسخ ہوا ہے اور نہ تخصیص، وہ عام فقہا کے اس خیال کو غلط بتاتے ہیں کہ اس آیت میں صرف کنوارے اور کنواری یعنی غیر شادی شدہ کے زنا کی سزا کا ذکر ہے، رہے شادی شدہ زانی اور زانیہ تو ان کی سزا رجم کا ذکر قرآن مجید کے بجائے احادیث میں ہے، مولانا کے نزدیک اس کو ماننے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ رسول قرآن

میں اضافہ و ترمیم اور تغیر و تبدل کا مجاز ہے جس کی خود قرآن نے تردید کی ہے کہ تم کہدو کہ مجھے اس کا حق نہیں کہ اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی کر دوں" (یونس: ۱۵) اس لیے ان کے نزدیک سورہ نور میں زانی و زانیہ سے صرف کنوارے اور کنواری مراد لینا عقلاً و نقلاً مستبعد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی جو سزائیں دیں ان کی بنیاد سورہ مائدہ کی آیات ۳۳ و ۳۴ ہے جن میں محاربین کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اور جرائم کی طرح زنا کے مرتکبین کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن سے زنا کا جرم تو سرزد ہو جاتا ہے مگر وہ معاشرہ کے لیے آفت و خطرہ یا حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ نہیں ہوتے، سورۂ نور میں اسی قسم کے زانیوں کی سزا کا ذکر ہے، مرتکبین زنا میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنا لیتے ہیں، دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کا ارتکاب کر کے معاشرہ اور حکومت کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں، ان کا حکم محاربین جیسا ہوگا جن کی مختلف سزاؤں میں ایک تَقْتِیْل (عبرتناک طریقہ پر قتل) بھی ہے چنانچہ اس طرح کے عادی مجرموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کیے جانے کی سزا دلائی، مولانا کے نزدیک دونوں قسموں میں کنوارے اور شادی شدہ کی کوئی تفریق نہیں ہے، فقہاء کے نزدیک زنا کی سزا سو کوڑے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ صرف کنوارے اور کنواریوں کے لیے ہے، رجم کی سزا سنت نے مقرر کی ہے اور وہ شادی شدہ زانیوں اور زانیات کے لیے ہے، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور اگر ذکر ہے تو وہ آیت منسوخ التلاوۃ ہے، مولانا اصلاحی کہتے ہیں کہ سو کوڑے کی سزا عام زانیوں کے لیے ہے اور رجم کی سزا مخصوص زانیوں کے لیے ہے

جس کا ذکر محاربین کے ضمن میں ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کی توضیح کی ہے، مصنف نے اپنے تین مضامین میں اسی خیال کی توثیق کی ہے اور لغت وعربیت اور عقل ونقل ہر اعتبار سے اس کو صحیح اور معترضین کے خیال کو غلط ٹھرایا ہے، اس سلسلہ میں قرآن وسنت کے باہمی تعلق، تبیین کی حقیقت اور نسخ وتخصیص سے اس کے فرق پر نتیجہ خیز بحث کی ہے، دوسرے مضامین بھی قرآنیات ہی سے متعلق ہیں، پہلے میں نبی ورسول کا فرق اور دوسرے میں اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ الخ میں اِنَّھَا کی ضمیر کے جمع کی تعیین پر محققانہ بحث کی ہے، میراث، شہادت اور دیت کے تعلق سے بھی قرآنی نقطۂ نظر کو دلنشین انداز میں پیش کیا ہے اور ان کے ضمن میں بھی فقہا کے بعض خیالات کی تردید دلائل سے کی ہے، دیت کے بارے میں مصنف کا یہ نقطہ قابل توجہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے دیت کی کسی خاص مقدار اور نوعیت کا تعین نہیں کیا ہے بلکہ اس بارے میں معاشرے کے دستور اور رواج کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، عربوں کا دستور ان کے تمدنی حالات اور تہذیبی روایات پر مبنی تھا، اب ان میں زمین وآسمان کا فرق ہوگیا ہے اس لیے اونٹوں کی دیت دیے جانے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، عاقلہ اور قتل خطا کی نئی صورتیں وجود میں آگئی ہیں، چونکہ قرآن کی ہدایت ہر دور کے لیے ہے پس اس معاملہ میں معروف کی پیروی کی جائیگی مگر اس زمانہ میں دیت کا کوئی قانون موجود نہیں ہے، اس لیے اس زمانے کے اہل اجتہاد اس کی جو صورت تجویز کریں گے معاشرہ اگر اسے قبول کر لیتا ہے تو ہمارے لیے وہی معروف قرار پائے گی جس کے مبنی قوانین میں حالات وزمانہ کی

تبدیلی سے تغیر ہو سکتا ہے مصنف کے بعض خیالات میں بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے اِنَّھَا کی ضمیر اور تبیین کی بعض مثالوں میں ہم کو بھی ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے، قرآن وحدیث کی باہمی نوعیت کے مسئلہ پر حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا ہے، تاہم انھوں نے یہ مضامین غور وفکر اور تحقیق وتدقیق سے لکھے ہیں، جن پر سنجیدگی اور غیر جانبداری سے غور کرنے کی ضرورت ہے، قدیم فقہا کے بعض آرا سے اختلاف کی بنا پر ان سے بدگمانی اہل علم کا شیوہ نہیں۔

فصل الخطاب فی فضل الکتاب مرتبہ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت تحریر نہیں پتہ: المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان۔

یہ رسالہ نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تصنیف لطیف ہے جو ان کی زندگی ہی میں شایع ہوگیا تھا، اب مشہور صاحب علم مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم نے اس کی اہمیت اور فائدے کی وجہ سے اسے پھر شایع کیا ہے، اس میں قرآن مجید کی عظمت وفضیلت، اس کی تلاوت کی اہمیت نیز اس کے خواص وفوائد پر مفید بحث کی گئی ہے۔

دو مسافر دو ملک مرتبہ جناب مسعود احمد برکاتی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، قیمت ۱۲ روپیے پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی۔ پاکستان۔

سنہ ۱۹۸۲ء میں حکیم محمد سعید اور ان کے رفیق جناب مسعود احمد برکاتی نے یورپ

(انگلستان وفرانس) کا سفر کیا تھا۔ اس کتاب میں برکاتی صاحب نے اسی کی روداد لکھی ہے جو ہمدرد فاؤنڈیشن کے سلسلۂ نونہال ادب کی ایک کڑی ہے، اس میں بچوں کی دلچسپی کے لیے مفید معلومات و تجربات بیان کیے گئے ہیں اور جا بجا تصویریں دی گئی ہیں نیز یہ کتاب آسان زبان اور دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔

سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — مرتبہ جناب حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴

قیمت ۳ روپیے، پتہ: ایضاً

یہ مختصر کتابچہ بچوں کے لیے آسان اور سلیس زبان اور شگفتہ انداز میں لکھا گیا ہے، اس میں اختصار کے ساتھ آپؐ کی پاکیزہ اور مقدس زندگی اور عمدہ اخلاق و عادات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، کوزے میں سمندر کو سمو دینا حکیم صاحب کا خاص کمال ہے۔

حرف معتبر از جناب احمد منیر صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مسلم بک سنٹر، ۲۰ گرین لین، اسمال ہیتھ، برمنگھم ۹ بی K-6

جناب احمد منیر صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں وہ دہلی سے پہلے کراچی گئے اور اب لندن میں مقیم ہیں لیکن وہاں بھی ان سے آداب سحر خیزی نہ چھوٹے اور شاعری کے حمام میں بھی انھوں نے اپنا زہد و تقدس باقی رکھا، یہ مجموعہ اسم بامسمیٰ ہے جو حمدیہ و نعتیہ کے علاوہ ملی نظموں پر بھی مشتمل ہے، مصنف نے عہد حاضر کے موضوعات و مسائل سے بھی تعرض کیا ہے، فن پر ان کی قدرت نے حسن بیان اور طریقۂ اظہار کی خوبی و دلکشی کو کم نہیں ہونے دیا ہے۔

"ض"